ڈاکٹر اسرار احمد

افکار و نظریات

تالیف

حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم

ناشر

دارالامین لاہور

نام کتاب: ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار و نظریات
مؤلف: حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب
صفحات: 160
سن اشاعت: 2013ء
ناشر: دارالامین لاہور

ملنے کے پتے

مکتبہ صفدریہ بہاولپور
مکتبہ قاسمیہ لاہور
ادارۂ اسلامیات لاہور
مکتبہ سید احمد شہید لاہور
مکتبہ عمر فاروق کراچی
اسلامی کتب خانہ کراچی
مکتبۃ القرآن کراچی
کتب خانہ رشیدیہ راولپنڈی

عرض ناشر

دارالامین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ تھوڑے عرصہ میں قارئین کے سامنے متعدد بیش قیمت کتب لایا ہے۔ اس کے لیے روز اول سے چناؤ کے دوران ان کتب کو ترجیح دی جاتی ہے جو خالص علمی و دعوتی انداز میں اسلام کا دفاع کرتی ہوں۔

حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم علمی حلقوں میں اپنے سنجیدہ علمی وتحقیقی انداز کی وجہ سے معروف ہیں۔ حضرت مدظلہم کی تصنیفات کا بڑا حصہ دفاع اسلام میں لکھی گئی تحریرات پر مشتمل ہے۔ حضرت مدظلہم کی تصنیفات میں سے **ڈاکٹر اسرار احمد افکار ونظریات** عرصہ دراز سے نایاب تھی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ''**عمار خان کا نیا اسلام**'' کے بعد اس اہم اور قیمتی تصنیف کی اشاعت کی سعادت بھی دارالامین کے حصہ میں آ رہی ہے۔ فللّٰہ الحمد والمنة۔

اس ایڈیشن کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اضافہ جات کے عنوان کے تحت موضوع سے متعلق حضرت مدظلہم کی غیر مطبوعہ تحریرات بھی شامل کی گئی ہیں۔

امید ہے کہ قارئین اس تصنیف کی بھی قدر فرمائیں گے۔

حمزہ احسانی

دارالامین

فہرست مضامین

باب	عنوان	صفحہ
1	ڈاکٹر اسرار صاحب دینی جماعت کی قیادت کے اہل نہیں	7
2	ڈاکٹر اسرار صاحب قرآن کے خلاف اعمال کی قبولیت کے لئے ایمان کو شرط نہیں مانتے	17
3	ڈاکٹر اسرار صاحب کا اہلسنت کے خلاف قول کہ حقیقی ایمان کے دو رکن ہیں، تصدیق ویقین اور جہاد	26
4	ڈاکٹر اسرار صاحب کا اہلسنت کے خلاف عقیدہ کہ گناہ پر اصرار ہمیشہ کے لئے جہنمی بناتا ہے	37
5	ڈاکٹر اسرار صاحب قرآن وحدیث کے مخالف ڈارون کا نظریہ ارتقاء تسلیم کرتے ہیں	41
6	ڈاکٹر اسرار صاحب کا اختراعی تصور دین و مذہب	53
7	ڈاکٹر اسرار صاحب کا تصور اقامت دین	69
8	ڈاکٹر اسرار صاحب کا غلط تصور عبادت	78
9	ایک غیر فرض کو فرض عین قرار دینا	88
10	مزارعت کے بارے میں غیر منصفانہ فکر	91
11	بغیر دلیل مضاربت کو ناپسندیدہ کہنا	97
12	خراجی زمین کے مفہوم سے عدم واقفیت	100
13	ڈاکٹر اسرار صاحب کا نیم تقلیدی فلسفہ	103

14	ڈاکٹر اسرار صاحب کے منابع فہم قرآن	107
15	اضافہ جات	114
16	ایک استفتاء اور اس کا جواب	115
17	ڈاکٹر اسرار اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	126
18	حضرت شیخ الہند، مولانا مدنی اور بانی تنظیم اسلامی	135
19	ڈاکٹر اسرار صاحب کی خدمت میں جواب آں غزل	143

پیش لفظ

الحمدلله رب العالمین و الصلوٰۃ والسلام علی نبیه سید المرسلین و علی آله و اصحابه اجمعین اما بعد

آج سے بارہ سال پیشتر ہماری کتاب ''ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار ونظریات تنقید کی میزان میں'' شائع ہوئی تھی۔ کچھ ہی عرصہ میں وہ کتاب نایاب ہوگئی۔ اس دوران ناشر کو بھی کسی دہشت گرد نے شہید کر دیا۔ اس لئے کتاب کی مزید طباعت واشاعت رکی رہی۔ کتاب کچھ ضخیم تھی اور اندازہ ہوا کہ ایسے موضوعات پر ضخیم کتاب کی طرف عام لوگوں کی رغبت بہت ہی کم ہوتی ہے اس لئے بہت عرصہ سے خیال تھا کہ کتاب کی تلخیص کر کے پھر شائع کی جائے۔ جامعہ میں عیدالاضحیٰ کی تعطیلات کی وجہ سے کچھ فرصت ملی تو تلخیص کرنے کا موقع بھی ملا۔ غرض تو فقط دین کا دفاع اور مسلمانوں کی خیر خواہی ہے۔ افسوس ہے کہ کیسے کیسے باصلاحیت لوگ کسی بھی وجہ سے راہ اعتدال سے ہٹ کر کن کن غلطیوں کے مرتکب ہوجاتے ہیں اور امت کو خالص نفع پہنچانے کے بجائے کچھ نفع کے ساتھ بہت سی گمراہیوں اور بے اعتدالیوں کی ملاوٹ بھی شامل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار صاحب کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ اگر وہ اوران کے ساتھی ہماری ان گزارشات کو قبول کریں اوران کے مطابق اپنی اصلاح کریں تو خود ان کے لئے بھی خیر ہوگی اور امت کا بھی کچھ بھلا ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کوشش کو قبول فرما کر اس کا ثواب ہمارے اساتذہ اور والدین کو عطا فرمائیں۔ وما توفیقی الا بالله علیه توکلت و الیه أنیب۔

عبدالواحد

دارالافتاء۔ جامعہ مدنیہ۔ لاہور

ذوالحجہ 1422ھ

باب: 1

ڈاکٹر اسرار صاحب دینی جماعت کی قیادت کے اہل نہیں

کسی دینی تحریک و جماعت کے سربراہ کے لئے ضروری اوصاف

جو شخص کسی دینی جماعت یا تحریک کا سربراہ ہو خاص طور سے جس جماعت یا تحریک کا نصب العین اجتماعی اصلاح یا انقلاب برپا کرنے کی کوشش ہو تو چونکہ اس نے کار نبوت کو اختیار کیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں کام کے لئے ضروری اوصاف نبوت بھی ہوں۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔

ان قام به رجل وحده قتل و لم يصلح للناس امر و لكن ان وجد عليه اعوانا صالحين و رجلا يراس عليهم مامونا على دين الله لا يحول (احكام القران للجصاص ج **2** بحث الامر بالمعروف و النهى عن المنكر)

اگر قوت کے ساتھ حکومت کی برائیوں کو روکنے کے لئے کوئی شخص تنہا کھڑا ہوگا تو وہ تو قتل کر دیا جائے گا اور لوگوں کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ البتہ یہ صورت ہے کہ اس کام کی سر انجامی میں کچھ اچھے صالح لوگ مددگار بن جائیں اور ان لوگوں کا سربراہ کوئی ایسا شخص ہو جس کے دین پر امن ہو (کہ پورے طور پر راہ حق میں اس نے اتنی ریاضت کر لی ہو کہ اب اس کے بدلنے (اور اصول وفروع میں راہ حق سے پھسلنے) کا اندیشہ نہ ہو۔

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ نے جب حضرت زید بن علیؒ کی حمایت کا اعلان کیا تو یوں فرمایا۔

شاهدت زيد بن على كما شاهدت اهله فما رأيت فى زمانه افقه منه و لا اعلم ......)

میں نے زید بن علی کو دیکھا ہے جیسا کہ میں نے ان کے خاندان کے دوسرے

افراد کو دیکھا ہے میں نے ان سے بڑھ کر فقیہ اور عالم کوئی نہیں پایا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قرآن و حدیث کے بڑے ماہر اور بڑے مجتہد تھے۔ انہوں نے یہ بات بطور ضابطہ کے ذکر کی ہے جو انہوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں معلوم کی۔ وہ ضابطہ یہ ہے کہ کسی دینی تحریک و جماعت کا سربراہ ایسا شخص ہونا چاہئے جو فقیہ و عالم ہو اور اہل حق کو اس کے دین کے بارے میں پورا اطمینان ہو اور ان کو اس کے دین میں راہ حق سے پھسلنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک فقیہ وہ شخص ہوتا ہے جس کو نفس کے نفع ونقصان کی باتوں کی معرفت حاصل ہو۔ علاوہ ازیں عمل نہ ہو تو اس کو علم ہی شمار نہیں کیا جاتا اور علم کے بھی صرف اس درجے کا اعتبار ہوتا ہے جو آدمی کے اندر رچ بس جائے اور آدمی کو اپنے تقاضے پورے کرنے پر از خود مجبور کر دے۔

پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دین کے علم کا سلسلۂ تلمذ نبی ﷺ کے دور سے جاری ہے۔ نبی ﷺ سے صحابہ نے سیکھا اور صحابہ سے تابعین نے سیکھا اور تابعین سے تبع تابعین نے سیکھا اور نسل در نسل یہ سلسلہ چلا آیا ہے۔ اسی طریقے سے دین کی باتوں کے صحیح صحیح مفاہم و مطالب نقل در نقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ کوئی شخص دینی علوم مثلاً حدیث، تفسیر اور اصول وغیرہ کی کتابوں کا محض خود ذاتی مطالعہ کر لے تو اس پر اطمینان نہیں ہوسکتا کہ اس نے صحیح مفہوم بھی سمجھا ہے یا نہیں۔ علاوہ ازیں اسی سلسلۂ تلمذ میں سے کسی نے اگر سلف صالحین اور خیر القرون کے طریقے کو کسی بھی معاملہ میں ترک کیا تو وہ بدعتی ہے اور اس سے آگے چلنے والا سلسلۂ تلمذ قابل اعتبار نہ ٹھہرے گا۔

لہٰذا یہاں فقیہ و عالم سے وہ شخص مراد ہے جس نے علمائے ربانیین سے دین کے اصول وفروع کا مکمل علم حاصل کیا ہو اور ان سے اپنا تزکیہ نفس کرایا ہو اور انہوں نے اس کے علم اور ایمان و دین پر امن و اطمینان کا اظہار کیا ہو۔

یہ ضابطہ ہے ان اوصاف نبوت کا جو کہ کار نبوت کے لئے بمنزلہ شرط کے ہیں۔ اگر کسی میں یہ ضابطہ مفقود ہو تو وہ ایسی سربراہی کے لائق نہیں۔ حضرت مولانا یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر اسرار صاحب ہی کے بارے میں جو بات کہی اس میں

مزید وضاحت ہے۔ لکھتے ہیں:

''پس جو شخص کہ علمی رسوخ میں لائق اعتماد نہ ہو، جس کا عملی معیار مستند نہ ہو، جس نے اہل قلوب اور ارباب باطن کی صحبت میں رہ کر اپنے اخلاق کا تزکیہ اور اپنی باطنی کیفیات کی اصلاح نہ کی ہو اس کے بارے میں یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ وہ کسی دینی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے نیابت نبوت کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے گا اور وہ کسی افراط و تفریط، خود رائی و کج روی کا شکار نہیں ہو گا۔ ایک ایسا شخص جس نے علوم نبوت کو کسی ماہر سے نہیں سیکھا، جس نے کسی مرد کامل کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیہ باطن نہیں کرایا، جس نے لائق اعتماد مشائخ سے حکمت دین کا درس نہیں لیا، جس نے کتاب و سنت کے اسرار و حقائق کو کسی جاننے والے سے نہیں سمجھا، جس نے اپنے علم و عمل عقائد و نظریات اور سیرت و اخلاق کو اسوہ نبوی میں ڈھالنے کی محنت و ریاضت نہیں کی اور جس کا فہم دین جنگل کی خود رو گھاس ہے (کیا) وہ دینی قیادت کا منصب سنبھال سکتا ہے''۔

ڈاکٹر اسرار صاحب مذکورہ بالا اوصاف کو ضروری نہیں سمجھتے

کسی دینی تحریک کے سربراہ کے لئے جو ضروری اوصاف اوپر ذکر ہوئے ڈاکٹر اسرار صاحب ان کا خلاصہ یہ نکالتے ہیں: ایک یہ کہ وہ باضابطہ اور مستند عالم دین ہو اور دوسرے یہ کہ متقی اور مزکی ہو (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی 522)

لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب ان اوصاف کو ضروری نہیں سمجھتے اور لکھتے ہیں۔

''ان میں سے دوسری چیز (یعنی تزکیہ نفس) تو کسی ناپ تول میں آنے والی نہیں ہے اور اس کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا آخری تجزیے میں شرط واحد یہ رہ جاتی ہے کہ علم دین کا حصول مروجہ معیارات کے مطابق ہو اور مسلمۃ المقام علماء سے سند فراغت حاصل کی ہو، اس پر سب سے پہلی گزارش تو راقم کی یہ ہے کہ کسی ایک ہی ایسے بڑے فتنے کا نام بتا دیا جائے جس کا آغاز کرنے والے مستند عالم دین اور مسلم حیثیت کے مالک علماء کرام

کے فیض یافتہ نہ ہوں۔ چنانچہ کیا مسلم انڈیا کی تاریخ کے سب سے بڑے فتنے یعنی دین الٰہی کے مصنف ابوالفضل اور فیضی مسلم عالم دین نہ تھے۔ اسی طرح عہد حاضر کے عظیم فتنوں کے بانیوں میں سے کیا سرسید احمد خان مرحوم وقت کے اعلیٰ ترین معیارات کے مطابق عالم دین اور بہترین علماء کے فیض یافتہ نہ تھے؟ کیا نور الدین بھیروی نے وقت کے چوٹی کے علماء سے کسب علم نہیں کیا تھا (اور واضح رہے کہ غلام احمد قادیانی کی گمراہی میں اصل دخل اسی شخص کو حاصل تھا) کیا مولوی عبداللہ چکڑالوی اور علامہ اسلم جیرا جپوری علماء میں سے نہ تھے؟ (غلام احمد پرویز کا ذکر چھوڑ دیجئے کہ وہ ان ہی اصحاب ثلاثہ یعنی سرسید، علامہ جیرا جپوری اور عبداللہ چکڑالوی کا خوشہ چین ہے خود کچھ نہیں) مزید قریب آ کر دیکھئے کیا مولانا امین احسن اصلاحی مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کے سند یافتہ فارغ التحصیل اور پھر علامہ فراہیؒ ایسے محقق قرآن اور محدث مبارکپوریؒ ایسے عالم و شارح حدیث نبوی ﷺ کے فیض یافتہ نہیں ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قریب کی مثال درکار ہو تو کیا ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی باضابطہ سند یافتہ ''فاضل علوم دینیہ'' اور خود حضرت مولانا بنوریؒ کے فیض یافتہ نہیں ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا دارومدار علم پر نہیں بلکہ صرف اور صرف دو چیزوں پر ہے۔ ایک انسان کی اپنی نیت و ارادہ اور دوسرے اللہ کی توفیق و تیسیر۔ اگر انسان کے اپنے دل میں کجی اور نیت میں فتور ہو اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی سنت کے مطابق کہ فَلَمَّا زَاغُوٓا أَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ اس سے توفیق خیر سلب فرما لے تو ایسا انسان جتنا بڑا عالم و فاضل ہو گا اتنا ہی بڑا فتنہ اٹھائے گا۔ بلکہ بڑے فتنے تو بڑے علماء و فضلاء ہی اٹھا سکتے ہیں۔ غریب عامی و اُمّی انسان فتنہ اٹھانا چاہے گا بھی تو کوئی بڑا فتنہ کیسے اٹھائے گا۔ یہی بات علماء کرام مولانا رومؒ کے اسی شعر کے حوالے سے بیان کیا کرتے ہیں کہ ؎

علم را بر دل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

اور یہی بات آنحضورﷺ کے اس قول میں وارد ہوئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ مسلمانوں کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی۔ آسمان تلے کی بدترین مخلوق (نام نہاد) علماء ہوں گے۔ فتنے ان ہی کے اندر سے اٹھیں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے "او کما قالﷺ"
(جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی 523)

ڈاکٹر اسرار صاحب کی بات متعدد وجوہات سے غلط ہے

1- ڈاکٹر اسرار صاحب نے مولانا روم رحمہ اللہ کا جو شعر نقل کیا ہے اس سے تو علم اور تزکیہ نفس دونوں ہی کی ضرورت معلوم ہوئی۔ مولانا یہی تو بتا رہے ہیں کہ تنہا علم جب کہ وہ تزکیہ قلب اور عمل سے خالی ہو سانپ کی طرح مضر ہے۔ البتہ جس شخص کو علم کے ساتھ تزکیہ نفس بھی حاصل ہو جائے وہ اللہ کا دوست اور ولی بن جاتا ہے۔ اسی کو حدیث میں علم نافع کہا گیا ہے۔ غرض مولانا روم رحمہ اللہ تو علم اور تزکیہ نفس دونوں کو ضروری بتا رہے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جو حدیث نقل کی ہے کہ ''آسمان تلے کی بدترین مخلوق (نام نہاد) علماء ہوں گے فتنے ان ہی کے اندر سے اٹھیں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے'' اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ تنہا علم جب تزکیہ نفس اور خدا خوفی سے خالی ہو تو وہ تو فتنوں کی آماجگاہ ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر اسرار صاحب۔ تزکیہ نفس (جس سے خدا خوفی حاصل ہوتی ہے اور حب جاہ و حب مال اور نفس امارہ کے رزائل سے نجات حاصل ہوتی ہے) کو یوں کہہ کر بڑی آسانی سے نظر انداز کرتے ہیں کہ ''یہ چیز کسی ناپ تول میں آنے والی نہیں ہے اور اس کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا''۔ حالانکہ خود قرآن پاک میں رسول اللہﷺ کا ایک منصب یہ بھی بتایا کہ آپ لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں۔ اور تعلیم قرآن کی طرح تزکیہ نفس کا سلسلہ امت میں تسلسل سے چلا آیا ہے۔ جس طرح ظاہری علم میں جب امتحان کے ذریعہ طالب علم کی استعداد کے پختہ اور صحیح ہونے کا پتہ چلتا ہے اسی طرح آثار واحوال دیکھ کر تزکیہ نفس کی راہ سلوک پر چلنے والوں کے

بارے میں اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب میں اگر اس کو ناپ تول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اس سے یہ لازم تو نہیں آتا کہ اس لائن اور فن والوں کو بھی یہ صلاحیت حاصل نہ ہو۔ آخر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے حضرت زید شہید رحمہ اللہ کے بارے میں جو گواہی دی اس میں یہ ہے مارایت فی زمانہ افقہ منه (میں نے ان کو ان کے زمانہ کا فقیہ ترین شخص پایا) جب کہ فقہ سے ان کی مراد ہے معرفة النفس ما لها و ما علیها یعنی نفس کا (خصوصاً آخرت کے اعتبار سے) اپنے فائدے اور نقصان کی چیزوں کو جاننا اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونا۔ تزکیہ نفس کا اندازہ کر کے اور اس کو پوری طرح ناپ تول کر ہی امام صاحب نے حضرت زید شہید رحمہ اللہ کے بارے میں فقیہ ترین ہونے کی گواہی دی۔

2- ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ''ہدایت و ضلالت کا دارومدار علم پر نہیں بلکہ صرف اور صرف دو چیزوں پر ہے ایک انسان کی اپنی نیت و ارادہ اور دوسرے اللہ کی توفیق و تیسیر''۔

ہم کہتے ہیں نیت و ارادہ کی درستگی کے لئے بھی علم و تزکیہ نفس کی ضرورت ہے۔ کس بات کا ارادہ کرنا جائز ہے اور کس کا نہیں اور آیا حالات کے بدلنے سے اس میں کوئی تغیر آتا ہے یا نہیں ان سب باتوں کا پتہ علم سے ہوگا۔ پھر علم کے بعد حب مال یا حب جاہ یا نفس پرستی آدمی کے ارادہ کو خراب نہ کرے یہ بات تزکیہ نفس سے حاصل ہوگی۔

توفیق کا مطلب ہے اسباب کو عمل خیر کے موافق کرنا اور تیسیر کا مطلب ہے عمل خیر کرنے کو آدمی پر آسان کرنا۔ اب یہ جاننے کے لئے کہ جو بات ہم کریں گے یا جو عمل ہم کریں گے وہ خیر ہے یا نہیں اس کے لئے علم کی ضرورت ہے اور یہ کہ اس کے کرنے میں کوئی شر شامل نہ ہو جائے اس کے لئے تزکیہ نفس کی ضرورت ہے۔ عمل خیر کے لئے صحیح علم بھی ہو جائے اور ضروری تزکیہ بھی حاصل ہو جائے یہ بھی توفیق و تیسیر کا حصہ ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب اتنی بنیادی بات نہیں سمجھے تو وہ دوسروں کی کیا راہنمائی کریں گے۔

مزید برآں ڈاکٹر صاحب کا یہ اعتراض عقل کی رو سے بھی صحیح نہیں کیونکہ جیسے بعض

بظاہر ماہرین کی MALPRACTICE سے یہ لازم نہیں آتا کہ مہارت کی شرط ہی اڑا دی جائے اور عطائیوں کو بھی PRACTICE کرنے کی سند دے دی جائے۔ ایسے ہی بعض بظاہر اہل علم کی گمراہی سے اور ان کے سبب فتنہ بننے سے یہ گنجائش نہیں نکلتی کہ بے علم یا کم علم لوگوں کے لئے لاعلمی یا کم علمی مانع نہ رہی بلکہ جیسے MALPRACTICE سے بچاؤ کے لئے شرط مہارت کی تاکید اور مزید کچھ ضوابط کی پابندی کرائی جاتی ہے ایسے ہی گمراہی و فتنہ سے بچاؤ کے لئے علم میں مہارت کی شرط کی تاکید کی جائے گی اور ساتھ ہی تزکیہ وغیرہ پر زور دیا جائے گا یہاں تک کہ عادت کے مطابق اس شخص کے دین پر امن محسوس ہونے لگے۔ شیطان کے اغوا سے اگرچہ کسی دور و مرحلہ میں بھی امن نہیں لیکن عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو شخص علم میں کمال حاصل کر لے اور اپنا تزکیہ باطن کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرماتے ہیں بلکہ کمال علم وغیرہ عام طور پر ایسے ہی شخص کو حاصل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے۔ من یرد اللّٰہ به خیرا یفقهه فی الدین (جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ کرتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں اور فقہ کا مطلب جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے وہ ہے۔ معرفة النفس مالها و ما علیها (نفس کا اپنے فائدے اور نقصان والے امور کو پہچاننا) جس میں علم ظاہر اور تزکیہ باطن دونوں شامل ہیں۔

ایک حدیث میں ہے۔

عن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ ان الله لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد و لکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤسا جهالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا و اضلوا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ علم کو کھینچ کر نہیں اٹھاتے کہ بندوں کے سینوں سے اس کو کھینچ کر نکال لیں بلکہ علم کو اٹھاتے ہیں علماء کو (موت دے کر) اٹھانے کے ساتھ یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ (پختہ کار اور ماہر) علماء نہ چھوڑیں گے (اور وہ بہت کم ہو جائیں گے یا ختم ہو جائیں گے) تو لوگ جاہلوں کو (جنہوں نے علمائے

راسخین سے علم حاصل نہ کیا ہو گا بلکہ ادھر ادھر سے اپنا مطالعہ کر کے کچا پکا علم حاصل کیا ہو گا ان کو) بڑا بنالیں گے اور ان سے دین کی باتیں پوچھی جائیں گی (اور ان سے قرآن کے درس کہلوائے جائیں گے) تو یہ (پختہ) علم کے بغیر دین کے مسائل بتائیں گے (اور قرآن کی تفسیر اپنی طرف سے کریں گے) پس خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

دیکھئے رسول اللہ ﷺ جہالت و لاعلمی کو گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کا سبب بتا رہے ہیں۔ تو اگر اس کے مقابلہ میں کوئی یہ کہے کہ واقعہ یہ ہے کہ ہدایت وضلالت کا دارو مدار علم پر نہیں بلکہ صرف اور صرف دو چیزوں پر ہے......تو ہمیں تو ڈر ہے کہ اس حدیث مبارکہ کا مصداق تو بالکل نقد سامنے آ رہا ہے اور ہمارے اس خوف پر مزید شواہد بھی موجود ہیں۔

3- ہمیں حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی کہ کوئی ایسا بڑا فتنہ بتا دیا جائے جس کا آغاز کرنے والا مستند عالم دین اور مسلم حیثیت کے مالک علماء کرام کا فیض یافتہ نہ ہو۔ لیجئے ان ہی کے پیشوا مودودی صاحب کا اٹھایا ہوا فتنہ اور ان کا پورا لٹریچر اور اس کو قبول کرنے والی جماعت۔

مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ کا قلم ہمارے اس دعویٰ کی تائید کرتا ہے۔

''......لیکن اتنا اندازہ نہ تھا کہ یہ فتنہ عالمگیر صورت اختیار کرے گا اور اکثر عرب ممالک میں یہ فتنہ بری صورت اختیار کرے گا اور دن بدن ان کے شاہکار قلم سے نئے نئے شگوفے پھوٹتے رہیں گے۔ صحابہ کرام اور انبیا کرام علیہم السلام کے حق میں ناشائستہ الفاظ استعمال ہوں گے۔ آخر تفہیم القرآن اور خلافت وملوکیت اور ترجمان القرآن میں روز بروز ایسی چیزیں نظر آئیں کہ اب معلوم ہوا کہ بلاشبہ ان کی تحریرات و تالیفات عہد حاضر کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اگرچہ چند مفید ابحاث بھی آ گئی ہیں۔ وَاِثۡمُهُمَا اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا والی بات ہے۔ اب حالت یہاں پہنچ گئی ہے کہ سکوت جرم عظیم معلوم ہوتا ہے اور چالیس سال جو مجرمانہ سکوت کیا اس پر بھی افسوس ہوا اور اب وقت آ گیا ہے کہ بلاخوف لومۃ لائم الف سے یاء تک ان کی تالیفات وتحریرات کو مطالعہ کر کے جو حق و

انصاف و دین کی حفاظت کا تقاضا ہو وہ پورا کیا جائے۔ واللہ سبحانہ ولی التوفیق، ص 58 (مودودی صاحب اور ان کی تحریرات کے متعلق چند اہم مضامین)

مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ جن کے تقوے کے ڈاکٹر صاحب بھی معترف ہیں (دیکھئے ص 27 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی) وہ مودودی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ جماعت گمراہ جماعت ہے۔ اس کے عقائد اہل سنت والجماعت اور قرآن وحدیث کے خلاف ہیں۔

اس جماعت کی کوشش اس اسلام کے لئے نہیں جو کہ حقیقی ہے بلکہ ایک نام نہاد مودودی صاحب کے اختراعی اور نئے اسلام کے لئے ہے۔ یہ لوگ عام مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور اپنا ہمدم بنانے کے لئے اسلام اور دین کا نام لیتے ہیں۔ ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اصلی اور دیندار ہیں۔ ان کے رسالوں اور کتابوں میں دینی پیرائے میں وہ بد دینی اور الحاد کی باتیں مندرج ہیں جن کو ظاہر بین اور ناواقف انسان سمجھ نہیں سکتا اور بالآخر اس اسلام سے جس کو رسول اللہ ﷺ لائے تھے اور امت محمدیہ جس پر ساڑھے تیرہ سو برس سے عمل پیرا رہی ہے بالکل علیحدہ اور بیزار ہو جاتا ہے۔ آپ حضرات سے امیدوار ہوں کہ اس فتنے سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے سکوت اور غفلت اور چشم پوشی کو روا نہ رکھیں''۔

مودودی صاحب کے مستند عالم اور مسلم حیثیت کے مالک علماء کرام کے فیض یافتہ نہ ہونے کی شہادت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ سے سنیئے:

''اس قسم کے لوگوں میں سے آج کل کی ایک مشہور شخصیت جناب ابو الاعلیٰ مودودی کی ہے جو بچپن ہی سے طباع و ذہین مگر معاشی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ابتداء میں اخبار بجنور میں ملازم ہوئے اور پھر دہلی میں جمعیت علماء ہند کے اخبار مسلم سے وابستہ رہے پھر چند سالوں کے بعد اخبار الجمعیۃ دہلی میں ملازم ہوئے جو جمعیت علماء ہند کا ترجمان تھا دہلی سے نکلتا تھا غالباً سہ روزہ تھا۔ تاریخ کے جواہر پاروں کے عنوان سے ان کے مضامین بہت آب و تاب سے

نکلتے تھے۔ اس طرح مودودی صاحب کی قلمی تربیت مولانا احمد سعید صاحب کے ذریعہ ہوتی گئی۔ والد مرحوم کی وفات کی وجہ سے اپنی تعلیم نہ صرف یہ کہ مکمل نہ کر سکے بلکہ بالکل ابتدائی عربی تعلیم کی کتابوں میں رہ گئے، نہ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہو سکے۔ پرائیویٹ انگریزی تعلیم حاصل کی اور انگریزی سے کچھ مناسبت ہوگئی۔ اس دور کے اچھے لکھنے والوں کی کتابوں اور تحریرات اور مجلّات و جرائد سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا اور قلمی قابلیت روز افزوں ہوتی گئی۔ بدقسمتی سے نہ کسی دینی درسگاہ سے فیض حاصل کر سکے نہ جدید علوم کے گریجویٹ بن سکے، نہ کسی پختہ کار عالم دین کی صحبت نصیب ہوسکی اور ایک مضمون میں خود اس کا اعتراف کیا ہے جو عرصہ ہوا کہ ہندوستان متحدہ میں مولانا عبدالحق مدنی مراد آبادی کے جواب میں شائع ہوا تھا۔ بلکہ بدقسمتی سے نیاز فتح پوری جیسے ملحد و زندیق کی صحبت نصیب رہی ان کی صحبت و رفاقت سے بہت کچھ غلط رجحانات و میلانات پیدا ہو گئے......'' (ص 54 مودودی صاحب اور ان کی تحریرات سے متعلق چند اہم مضامین)۔

تنبیہ-1: عجیب اتفاق دیکھئے کہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے جتنے فتنہ گروں کے نام گنوائے ہیں ان میں فتنہ کی جڑ پہلے سے موجود تھی یعنی اجتہاد کی اہلیت نہ ہونے کے باوجود ترک تقلید اور اپنے کو کسی دوسرے اہل اجتہاد کی رہنمائی کا محتاج نہ سمجھنا۔ جب اپنے اندر اہلیت و صلاحیت نہ ہو اور دوسرے اہل کی رہنمائی بھی قبول نہ کرے تو اس بات کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ ایسے لوگ فتنے ہی اٹھائیں گے اور شیطان کے آلہ کار بنیں گے۔ یہی مرض مودودی صاحب میں بھی تھا اور اسی مرض کو ڈاکٹر اسرار صاحب بھی اپنے ساتھ چمٹائے ہوئے ہیں بلکہ اپنی جماعت کے لئے بھی اس کو پسند کرتے ہیں اور وہ چونکہ اس کو مرض ہی نہیں سمجھتے بلکہ ایک نوع کا کمال سمجھتے ہیں اس لئے وہ اپنے مرض کی صحیح تشخیص کرنے سے عاجز ہیں۔

تنبیہ-2: یہاں جو یہ ذکر کیا گیا کہ ڈاکٹر اسرار صاحب میں دینی قیادت کے ضروری اوصاف نہیں ہیں تو اس اجمال کی تفصیل اگلے ابواب میں سامنے آ رہی ہے۔

باب: 2

ڈاکٹر اسرار صاحب قرآن کے خلاف اعمال کی قبولیت کے لئے ایمان کو شرط نہیں مانتے

''حقیقت و ماہیت ایمان'' کے عنوان سے ڈاکٹر اسرار صاحب کی ایک آڈیو کیسٹ دستیاب ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

''قانونی مومن (یعنی جس نے زبان سے کلمہ پڑھ لیا ہو اس) کی باطنی اعتبار سے تین کیفیتیں ہیں:

1- دل میں مثبت طور پر ایمان ہو۔ اس کو وہ حقیقی ایمان اور Plus Value سے تعبیر کرتے ہیں۔

2- پہلی کے برعکس یعنی دل میں کفر ہو۔ یہ منافق ہے اور اس کو وہ Minus Value سے تعبیر کرتے ہیں۔

3- ان دونوں کے بین بین Zero Value ہے کہ نہ دل میں مثبت طور پر ایمان ہو اور نہ منفی طور پر نفاق ہو بلکہ ایک خلا کی کیفیت ہے اندر کچھ بھی نہیں۔ ہم میں سے اکثر کا حال یہی ہے۔ یہ پونجی وراثت میں ملی ہے لیکن دلوں کو ٹٹولیں تو یقین قلبی والا ایمان نہیں الا ماشاء اللہ۔

اس کی دلیل سورہ حجرات کی یہ آیت ہے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُوْلُوْآ أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ (سورہ حجرات: 14)

بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے

لیکن تم یوں کہو کہ ہم فرمانبردار ہوئے اور ابھی تک داخل نہیں ہوا ایمان تمہارے دلوں میں۔

بعض لوگوں کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ یہ منافقین کا ذکر ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور یہ مغالطہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ پھر تو یہ منافق ہوئے کہ ظاہر میں اسلام ہے اور دل میں ایمان نہیں کیونکہ آگے اعمال کے قبول ہونے کا فرمان ہے۔

وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (سورہ حجرات: 14)

اور اگر تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی تو نہیں کمی کرے گا تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی۔

جب کہ منافق کا تو کوئی بھی عمل مقبول نہیں۔

اگرچہ قانون تو یہی بنتا ہے کہ اگر ایمان نہیں تو اطاعت مقبول نہ ہو لیکن اللہ اپنی شان غفاری و رحیمی کی وجہ سے قبول کر لیتے ہیں''۔ (حقیقت و ماہیت ایمان نمبر 4)

اپنے اسی دعوے کی تائید میں ڈاکٹر اسرار صاحب نے اپنے رسالہ میثاق شمارہ دسمبر 1990ء میں ''ایمان اور اسلام کا فرق اور قانونی مسلمان کی باطنی اعتبار سے تین ممکن حالتیں کے عنوان کے تحت علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب الایمان کی ایک فصل کے ابتدائی کچھ حصے کا ترجمہ بھی شائع کیا۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ دین اسلام اور قرآن کا قانون یہی ہے کہ ایمان کے بغیر اطاعت قبول نہیں کیونکہ قرآن پاک میں ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحَاتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ (سورہ انبیاء: 94)

''اور جو کوئی نیک عمل کرے درانحالیکہ وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہیں ہوگی۔''

لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب کا دعویٰ ہے کہ قرآن نے اپنے قانون کو خود ہی توڑ دیا ہے اور پھر اس دعوے کی دلیل محض ڈاکٹر صاحب کی کج فہمی یا غلط فہمی ہے کیونکہ سورہ

حجرات کی مذکورہ بالا آیت سے جو بات ڈاکٹر اسرار صاحب نے سمجھی ہے وہ کسی بھی مفسر کو سمجھ میں نہیں آئی اور نہ ہی علامہ ابن تیمیہ نے سمجھی بلکہ خود ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اصل بات ڈاکٹر صاحب کی کج فہمی کا مظلوم شکار بن کر رہ گئی۔

سورہ حجرات میں مذکور اعراب سے کون لوگ مراد ہیں؟ اکثر حضرات کی رائے ہے کہ یہ منافق لوگ تھے کہ ان کو ایمان سرے سے حاصل ہی نہ تھا اور ان کو جو یہ کہا گیا کہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو اس سے مراد یہ ہے کہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہوئے ان پر ایمان لاؤ اور ان کے دیگر احکامات کو پورا کرو۔ بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ یہ اعراب مسلمان تھے اور ان کو ایمان بھی حاصل تھا لیکن وہ اتنا کمزور تھا کہ ان کے لئے ایمان کا دعویٰ کرنا برمحل نہ تھا۔

تفسیر بیضاوی میں ہے:

(قالت الاعراب آمنا)۔ نزلت فی نفر من بنی اسد قدموا المدینة فی سنة جدبة واظهروا الشهادتين و كانوا يقولون لرسول الله ﷺ اتيناك بالاثقال و العيال ولم نقاتلك كما قاتلك بنو فلان يريدون الصدقة و يمنون (قل لم تومنوا) اذ الايمان تصديق مع ثقة و طمانينة قلب و لم يحصل لكم والا لما مننتم على الرسول عليه الصلوة والسلام بالاسلام و ترك المقاتلة كما دل عليه آخر السورة (ولكن قولوا اسلمنا) فان الاسلام انقياد و دخول فی السلم واظهار الشهادتين و ترك المحاربة۔ (وان تطيعوا الله و رسوله ......) بالاخلاص و ترك النفاق (لا يلتكم من اعمالكم) لا ينقصكم من اجورها (شيئا) (ان الله غفور) لما فرط من المطيعين (رحيم) بالتفضل عليهم۔

یہ آیت بنو اسد کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جو قحط کے سال مدینہ منورہ آئے کلمہ کا اقرار کیا اور رسول اللہ ﷺ سے کہتے تھے کہ ہم آپ کے پاس بوجھ اور عیال لے کر آئے ہیں اور ہم نے آپ سے لڑائی نہیں کی جیسا کہ فلاں قبیلے والوں نے آپ سے لڑائی کی تھی۔ ان کا مقصد صدقہ حاصل کرنا تھا اور احسان رکھتے تھے (آپ کہہ

دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے) کیونکہ ایمان تو دل کی پختگی اور اطمینان کے ساتھ تصدیق کرنے کو کہتے ہیں اور یہ تمہیں ابھی تک حاصل نہیں ہوئی ورنہ تم رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور ترک قتال کا احسان نہ رکھتے جیسا کہ اس پر سورت کا آخری حصہ دلالت کرتا ہے (اور لیکن یہ کہو کہ ہم مطیع ہو گئے) کیونکہ اسلام اطاعت گزاری اور سلامتی میں داخل ہونے اور کلمہ شہادت کے اظہار اور ترک قتال کو کہتے ہیں (اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو) اخلاص اور ترک نفاق کے ساتھ (نہیں کم کرے گا تمہارے اعمال میں سے) نہیں کم کرے گا ان کے اجر میں سے (کچھ) بلاشبہ اللہ بخشنے والے ہیں اس کو جو اطاعت گزاروں سے کوتاہی ہوئی (رحم کرنے والے ہیں)۔ ان پر مہربانی فرما کر۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ" کا مطلب ہے کہ اگر تم اخلاص کے ساتھ اور نفاق کو چھوڑ کر اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال کے اجر میں سے کچھ کم نہ کرے گا۔ علامہ بیضاوی کے نزدیک اگر ان میں نفاق نہ تھا تو پھر وہ یہ کیوں کہتے کہ نفاق کو چھوڑ کر اطاعت اختیار کرو۔

2- روح المعانی میں ہے۔

قال المجاهد نزلت فی بنی اسد بن خزيمة قبيلة تجاورالمدينة اظهروا الاسلام و قلوبهم دغلة انما يحبون المغانم و عرض الدنيا (وان تطيعوا الله و رسوله) بالاخلاص و ترك النفاق۔

صحابہ کے شاگرد مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت قبیلہ بنو اسد کے بارے میں نازل ہوئی جو مدینہ میں رہنے لگا تھا اور قبیلہ والوں نے اسلام کا اظہار کیا حالانکہ ان کے دلوں میں کھوٹ تھا۔ ان کی غرض تو مال غنیمت اور دنیوی ساز و سامان تھا فرمایا اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اخلاص کے ساتھ اور ترک نفاق کے ساتھ۔

3- تفسیر نسفی میں ہے (وان تطيعوا الله و رسوله) فی السربترك النفاق۔

اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو چھپی حالت میں نفاق کو ترک کر کے۔

4- تفسیر ابن عباس میں ہے۔

نزلت هذه الاية فى بنى اسد اصابتهم سنة شديدة فدخلوا فى الاسلام متوافرين باهاليهم و ذراريهم و جاء وا الى النبى ﷺ بالمدينة ...... وكانوا منافقين يقولون اطعمنا و اكرمنا يا رسول الله فانا مخلصون مصدقون فى ايماننا و كانوا منافقين فى دينهم كا ذبين فى قولهم فذكر الله مقالتهم فقال۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بنو اسد کے قبیلہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ وہ سخت قحط میں مبتلا ہوئے تو اپنے اہل عیال سمیت کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے اور نبی ﷺ کے پاس مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے ......اور یہ لوگ منافق تھے اور یوں کہتے تھے کہ اے اللہ کے رسول ہمیں اناج بھی دیجئے اور ہمارا اکرام بھی کیجئے کیونکہ ہم مخلص ہیں اور اپنے ایمان میں سچے ہیں حالانکہ وہ اپنے دین میں منافق تھے اور اپنی بات میں جھوٹے تھے تو اللہ تعالی نے ان کی بات ذکر کر کے فرمایا۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

وانما قلنا هذا لان البخارى رحمه الله ذهب الى ان هؤلاء كانوا منافقين يظهرون الايمان و ليسوا كذلك۔

”ہم نے یہ بات اس لئے کہی ہے کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ یہ لوگ منافق تھے جو ایمان کا اظہار کرتے تھے حالانکہ مومن نہ تھے (بلکہ منافق تھے)۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ بیان القرآن میں فرماتے ہیں۔”یہ (بعضے) گنوار (بنی اسد وغیرہ کے آپ کے پاس آ کر جو ایمان لانے کے مدعی ہوتے ہیں۔ یہ اس میں کئی امر بدیع کے مرتکب ہوتے ہیں ایک تو کذب کہ بلاتصدیق قلب محض زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے (کیونکہ وہ موقوف ہے تصدیق قلبی پر اور وہ منفی ہے جیسا عنقریب آتا ہے ولما یدخل الایمان) لیکن (ہاں) یوں کہو کہ (ہم مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو گئے (اور اطاعت

بمعنی ترک مخالفت محض ظاہری موافقت سے بھی متحقق ہو جاتی ہے، اور (باقی) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (اس لئے ایمان کا دعویٰ مت کرو) اور (گو اب تک تم ایمان نہیں لائے لیکن اب بھی) اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا (سب باتوں میں) کہنا مان لو (جس میں یہ بھی داخل ہے کہ دل سے ایمان لے آؤ) تو اللہ تمہارے اعمال میں سے (جو کہ بعد ایمان کے ہوں گے محض اس وقت کے کفر و کذب کی وجہ سے جو اس وقت کے اعتبار سے گذشتہ ہوگا) ذرا بھی کم نہ کرے گا“۔

صحابہ اور تابعین اور امام بخاری اور ان کے علاوہ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اعراب منافق تھے لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب کا ادعائے قرآن فہمی دیکھئے کہ سب کو غلط کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ”بعض لوگوں کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ یہ منافقین کا ذکر ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے“ اور اپنے دعوے پر وہ دلیل لائے ہیں جو قرآن، حدیث اور تفسیر کے خلاف ہے اور اس حدیث کا مصداق ہیں۔

من قال فى القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار

جو شخص قرآن کے بارے میں (ضروری) علم کے بغیر کچھ کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ لوگ منافق نہ تھے بلکہ بہت کمزور ایمان والے تھے اور ان کو اگرچہ نفس تصدیق تو حاصل ہو چکی تھی لیکن اس میں قوت اور چمک نہیں آئی تھی۔

1- تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

فدل هذا ان هولاء الاعراب المذكورين فى هذه الاية ليسوا بمنافقين و انما هم مسلمون لم يستحكم الايمان فى قلوبهم فادعوا لانفسهم مقاما اعلىٰ مما و صلوا اليه فادبوا فى ذلك و هذا معنى قول ابن عباس رضى الله عنهما و ابراهيم النخعى وقتادة و اختاره ابن جرير۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں مذکور اعراب منافق نہ تھے بلکہ مسلمان تھے ایمان ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہوا تھا تو انہوں نے اپنے لئے ایسے مقام کا دعویٰ کیا

جو ابھی ان کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا اس پر تادیب کی گئی۔ یہ ابن عباس، ابراہیم نخعی اور قتادہ کے قول کا معنی ہے اور اس کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔

تفسیر کبیر میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ویحتمل ان یقال بان الایة فیها اشارة الی حال المؤلفة اذا اسلموا و یکون ایمانهم بعد ضعیفا۔ قال لهم لم تومنوا الان الایمان ایقان و ذلك بعد لم یدخل فی قلوبکم و سیدخل باطلاعکم علی محاسن الاسلام۔

(ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ کہا جائے کہ آیت میں مؤلفۃ القلوب کی طرف اشارہ ہے جب کہ وہ اطاعت قبول کرلیں اور ان کا ایمان ابھی تک کمزور ہو تو ان سے کہا کہ تم ایمان نہیں لائے کیونکہ ایمان تو یقین (کی رونق) کو کہتے ہیں جو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور محاسن اسلام کو معلوم کر کے حاصل ہوگا۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس دوسری رائے کو اختیار کیا ہے جس کی تائید ان کی کتاب الایمان کی اس عبارت سے ہوتی ہے۔

''اسی طرح ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے اسلام کے کچھ محاسن آتے ہیں جو اس کے اسلام قبول کرنے کے لئے داعی بنتے ہیں (یاد رہے کہ دین و شریعت کی اصطلاح میں ایمان و اسلام کا ایک ہی معنی ہے۔ ناقل) اور یہ بھی صورت ہوتی ہے کہ ایک شخص مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوتا ہے اور ان میں پرورش پاتا ہے تو اسلام کے کچھ محاسن اور کفر کی کچھ برائیوں سے مطلع ہونے کے باعث اس کو اسلام سے محبت ہوتی ہے۔

لیکن اس قسم کے بہت سے لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب وہ اسلام پر کئے گئے اعتراضات سنتے ہیں تو شکوک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد بھی نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ لوگ اس زمرے میں شامل نہیں ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَ رَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ **(سورہ حجرات: 15)**

ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ پھر

شبہ نہ کریں اور لڑیں اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے اور نہ ہی باطنی اعتبار سے یہ منافق ہوتے ہیں کہ دل میں کفر کو چھپائے ہوئے ہیں۔

لہٰذا ایسے لوگ نہ تو پکے و حقیقی مومن ہوتے ہیں اور نہ ہی منافق ہوتے ہیں اور نہ ہی مرتکب کبائر ہوتے ہیں بلکہ ظاہری طاعات تو کرتے ہیں البتہ ایمان کے جو حقائق پکے و حقیقی مومن کو حاصل ہوتے ہیں ان سے یہ محروم ہوتے ہیں۔ پس ان کے پاس ایمان تو ہے لیکن یہ پکے و حقیقی مومن نہیں اور یہ جو نیکیاں کرتے ہیں ان پر یہ اجر پاتے ہیں اسی لئے ارشاد فرمایا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا اور اسی لئے فرمایا:

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ **(سورہ حجرات: 17)**

یہ لوگ آپ پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوئے۔ آپ کہہ دیجئے مجھ پر احسان نہ رکھو اپنے اسلام لانے کا بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو راہ دی ایمان کی اگر تم (اپنے اس قول میں کہ ہم ایمان لائے) سچے ہو۔

فرمایا اگر تم (اپنے ایمان کے دعوے میں) سچے ہو تو اللہ نے تم پر احسان کیا کہ تمہیں ایمان کی راہ دکھائی۔ یہ ارشاد اس حقیقت کا مقتضی ہے کہ وہ اپنے قول آمنّا میں سچے تھے۔ البتہ ان کی سچائی:

1- یا تو اس معنی میں تھی کہ وہ:

آمَنُوا بِاللَّهِ وَ رَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

یعنی جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر انہوں نے شک نہیں کیا اور جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں وہی لوگ سچے ہیں۔

2- یا اس معنی میں تھی کہ وہ منافقین کی مانند نہ تھے بلکہ صاحب ایمان تھے اگرچہ ان کے لئے یہ جائز نہ تھا کہ (کمزور ایمان کے ہوتے ہوئے) وہ مطلق ایمان کا دعوی کریں (جس سے کامل ایمان سمجھ میں آتا ہے کیونکہ کمزور ایمان تو مسلم و مومن کے

شایان شان ہی نہیں وہ بھی خصوصاً دور نبوی میں)۔

یہ دوسرا معنی ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ...... اللہ تعالیٰ نے (قرآن پاک میں دعوائے ایمان کرنے والوں میں سے) صرف منافقین کو جھوٹا کہا کسی اور کو نہیں کہا۔ اور اعراب کو بھی جھوٹا نہیں کہا بلکہ یوں فرمایا لم تومنوا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے لا یومن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه (تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے)اور لا یومن من لا یامن جاره بوائقه (وہ شخص مومن نہیں جس کا پڑوسی اس کے ایذاء رسانیوں سے امن میں نہ ہو)۔ جب کہ یہ حدیثیں منافقین کے بارے میں نہیں ہیں اور آیت کا سیاق اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت اس وجہ سے کی کہ انہوں نے اپنی جہالت واجڈ پنے کی بناء پر اسلام کا احسان جتلایا اور مافی القلب کا اظہار کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تو اس کا علم تھا کیونکہ ارشاد فرمایا:

قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللّٰهَ بِدِينِكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ۔

آپ کہئے کیا تم جتلاتے ہو اللہ کو اپنی دینداری حالانکہ اللہ کو تو خبر ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں۔

اگر ان کے دل میں کچھ بھی دین (وایمان) نہ ہوتا تو وہ اللہ کو اپنے دین کے بارے میں نہ جتلاتے کیونکہ ظاہری اسلام کو تو ہر کوئی پہچان لیتا ہے''۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی یہ پوری عبارت پڑھ کر ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی ذرا بھی یہ خیال کرے گا کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک اعراب کی باطنی حالت Zero Value کی تھی بلکہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تو بار بار ان کے ایمان کا برملا اظہار کر رہے ہیں جیسا کہ خط کشیدہ مقامات سے ظاہر ہے اگرچہ اتنی بات ہے کہ ان میں موجود ایمان کمزور اور ناقص درجے کا تھا اعلیٰ درجہ کا نہیں تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ خواہ کتنا ہی کمزور و ناقص کیوں نہ ہو مثبت طور پر موجود تو ہے لہٰذا یہ Plus Value ہے۔ اس کو Zero Value کہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

باب : 3

ڈاکٹر اسرار صاحب کا اہلسنت کے خلاف قول کہ حقیقی ایمان کے دو رکن ہیں۔ تصدیق و یقین اور جہاد

ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ حقیقی ایمان کے دو رکن ہیں۔ تصدیق و یقین اور جہاد۔ اور حقیقی ایمان کے بارے میں ان ہی کا کہنا ہے کہ یہ وہ ایمان ہے کہ جو آخرت میں معتبر ہوگا۔ نیز یہ کہ مثبت جانب یقین پایا جائے تو ایمان ثابت ہوگا۔ اس کو وہ Plus value سے تعبیر کرتے ہیں اور پھر اس مثبت کیفیت میں تفاوت کے قائل ہیں جس کی بنا پر اگر مثبت اکائی کا عشر عشیر بھی ہو تو ایمان ثابت ہو جانا چاہئے۔ بس قلب خالی نہ ہونا چاہئے اور نہ ہی منفی کیفیت ہونی چاہئے جو کہ نفاق ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب ان دونوں ارکان کے باہمی تلازم کے اس حد تک قائل ہیں کہ کہتے ہیں کہ اگر جہاد (اپنے وسیع ترین معنوں میں) ہے تو ایمان ہے اور جہاد نہیں تو ایمان نہیں،

لیکن وہ حقیقی ایمان جو عبارت ہے یقین قلبی سے لازماً عمل میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر عمل میں تبدیلی نہ پیدا ہو تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ حقیقی ایمان موجود نہیں (راہ نجات ص 33)

لیکن جب یہی ایمان تصدیق بالقلب کے درجے کو پہنچ جاتا ہے یعنی یقین بن کر دل میں اتر جاتا ہے تو پھر عمل کا بدل جانا لازمی ہے (راہ نجات 24)

واللہ لا یومن واللہ لا یومن و اللہ لا یومن قالوا من یا رسول اللہ قال الذی لا یأمن جاره بوائقه۔ غور فرمائیے کہ آنحضور ﷺ کس قدر تاکید کے

ساتھ ایمان کی نفی کلی کا اعلان فرما رہے ہیں...... کیا اس کے بعد بھی اس خیال کی گنجائش ہے کہ ایمان اور عمل دو علیحدہ چیزیں ہیں اور باہم لازم وملزوم نہیں (راہ نجات 24)

''اس لئے کہ انسان کا عملی رویہ اس کے یقین ہی پر مبنی ہوتا ہے جیسے ہمیں یقین ہے کہ آگ جلا دیتی ہے تو ہم آگ میں ایک انگلی تک ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ یقین تو دور کی بات ہے انسان کا عمل تو گمان سے بھی متاثر ہو جاتا ہے جیسے ہمیں معلوم ہے کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے لیکن اگر گمان سا ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ سانپ زہریلا ہو تو اس گمان کے نتیجہ میں ہم لازماً اس سے بچتے ہیں'' (راہ نجات 25-24)

''...... پھر اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ خدا ہے اور وہ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے ...... تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے عمل میں تبدیلی پیدا نہ ہو اور وہ گناہ اور معصیت کی زندگی بسر کرتا رہے، یہی امر ہے جو حضور ﷺ کے اس قول مبارک میں بیان ہوا ہے کہ لایزنی زانٍ حین یزنی و ھو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق و ھو مومن ولا یشرب الخمرحین یشرب و ھو مومن ...... بلکہ ان گناہوں کا صدور ہوتا ہی اس وقت ہے جب کسی سبب سے حقیقی ایمان دل سے زائل ہو جاتا ہے۔ گویا ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دونوں باہم لازم وملزوم ہیں بلکہ صحیح اور درست عمل اور عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار ایمان حقیقی کا لازمی جزو ہیں''۔ (راہ نجات: ص25)

''راقم کا موقف یہ ہے کہ میں اس دنیا میں کسی کے دعوی اسلام و ایمان کی قبولیت کا دارو مدار صرف اس کے قول کو قرار دیتا ہوں عمل کی بنیاد پر کسی کے دعویٰ اسلام کو رد کر دینا درست نہیں سمجھتا۔ چنانچہ میرے نزدیک گناہ کبیرہ کے مرتکب کی بھی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔ تکفیر کی صرف ایک صورت درست ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اسلام کی کسی بنیادی بات (جیسے مثلاً ختم نبوت) کا انکار کرے یا اس کی ایسی تعبیر کرے جو انکار کو مستلزم ہو، رہا آخرت کا معاملہ تو وہ اللہ

کے حوالہ ہے، وہ علیم بذات الصدور ہے۔ چنانچہ اپنے علم کامل کی اساس پر فیصلہ کرے گا۔ البتہ اصولاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں صرف وہی ایمان معتبر ہوگا جو کسی نہ کسی درجے میں تصدیق بالقلب یعنی دلی یقین کے ساتھ ہو اور اس مرتبہ پر اعمال صالحہ بھی ایمان کے ذیل میں آ جاتے ہیں'' (ص 27 میثاق۔ مارچ 1985ء)

ہم کہتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے یہاں جو عقیدہ ظاہر کیا ہے وہ ایک بدعتی فرقہ معتزلہ کا ہے۔ اہلسنت کا عقیدہ اس سے بہت مختلف ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ جن کو ڈاکٹر اسرار صاحب گذشتہ صدی کا مجدد مانتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

''مصداق ایمان میں اعمال کو داخل کرنے میں تین مذہب ہیں، ایک یہ کہ اعمال حقیقت ایمان شرعی کے لئے جز حقیقی ہیں۔ اور و اذا فات الجزء فات الکل۔ دوسرے یہ کہ اعمال ایمان سے بالکل خارج ہیں حتیٰ کہ مصداق ایمان سے بھی بے تعلق ہیں۔ بلکہ الایمان قول بلا عمل ان کا مقولہ ہے۔ تیسرے یہ کہ حقیقت ایمانی سے خارج ہیں مگر کمال انسانی کے لئے موقوف علیہ ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اعمال حقیقت ایمانی سے تو خارج ہیں مگر کمال ایمانی کے جزو ہیں اور اس میں داخل ہیں۔ یہ تیسرا مذہب اہل سنت کا ہے۔ اور پہلا خوارج و معتزلہ کا ہے اور دوسرا مرجئہ کا۔ اور اہل سنت میں جو اس مسئلہ میں خلاف منقول ہے اس کے لفظی ہونے میں وہی شک کرسکتا ہے جو الفاظ سے معانی تک نہیں پہنچ سکتا کما صرح به علماء الفریقین" (الابواب والتراجم)

مسایرہ (جس کی شرح مسامرہ ہے اس) میں ہے۔

فقیل ھو (ای الایمان) التصدیق بالقلب فقط و ھو مختار جمھور الاشاعرة او مع الطاعة و ھو قول الخوارج ولذاکفروا بالذنب لانتفاء جزء الماھیة او باللسان فقط و ھو قول الکرامیه فان طابق تصدیق القلب

فهومومن ناج والاهومومن مخلد فی النار او بالقلب و اللسان و هو منقول عن ابی حنیفة و مشهور عن اصحابه و بعض المحققین من الاشاعرة۔

(ص 33 مسامره شرح مسایره مصری)

کہا گیا ہے کہ ایمان فقط تصدیق قلبی کا نام ہے یہ جمہور اشاعرہ کا مختار مذہب ہے یا طاعت کے ساتھ ہے یہ خوارج کا قول ہے۔ اسی بنا پر وہ گناہ پر تکفیر کرتے ہیں کیونکہ اس میں ماہیت ایمان کے ایک جزو کا انتفاء ہے یا ایمان فقط زبان سے ہے یہ کرامیہ کا قول ہے۔ پھر اگر تصدیق قلبی بھی ہو تو وہ شخص ناجی مومن ہے ورنہ ہمیشہ جہنم میں رہنے والا مومن ہے۔ یا ایمان دل و زبان کے ساتھ ہے یہ امام ابوحنیفہ سے منقول ہے اور ان کے اصحاب اور بعض محققین اشاعرہ کا مشہور مذہب ہے۔

مذکورہ بالا حوالجات سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ تصدیق قلبی اور عمل دونوں ہی کو ایمان کے رکن اس طرح سے قرار دینا کہ اگر عمل نہ رہے تو ایمان بھی نہ رہے یہ اہلسنت کا عقیدہ نہیں بلکہ معتزلہ اور خوارج کا عقیدہ ہے۔ اسی بات کو علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں یوں لکھتے ہیں:

والکلام ههنا فی مقامین۔ احدهما کونه قولا و عملا و الثانی کو نه یزید و ینقص فاما القول فالمراد به النطق بالشهادتین و اما العمل فالمراد به ما هوا عم من عمل القلب والجوارح لید خل الاعتقاد والعبادات و مراد من ادخل ذلك فی تعریف الایمان و من نفاه انما هو بالنظر الیٰ ماعند الله تعالیٰ فالسلف قالوا هو اعتقاد بالقلب و نطق باللسان و عمل بالا رکان و ارادوا بذلك ان الاعمال شرط فی کماله و من هنا نشأ لهم القول بالزیادة والنقص کما سیأتی والمرجئة قالوا هو اعتقاد و نطق فقط۔ والکرامیه قالوا هو نطق فقط۔ والمعتزلة قالوا هو العمل والنطق والاعتقاد و الفارق بینهم و بین السلف انهم جعلوا الاعمال شرطا فی صحته و السلف جعلوها شرطا فی

کماله و هذا کله کما قلنا بالنظر الی ماعند اللّٰه تعالیٰ اما بالنظر الیٰ ما عندنا فالایمان هوالا قرار فقط فمن اقر اجریت علیه الاحکام فی الدین ولم یحکم علیه بکفر الا ان اقترن به فعل یدل علی کفره کالسجود للصنم۔

یہاں گفتگو دو باتوں میں ہے ایک ایمان کے قول وعمل ہونے میں دوسرے اس کے کم و بیش ہونے میں۔ جہاں تک قول کا تعلق ہے تو اس سے مراد شہادتین کو زبان سے ادا کرنا ہے، رہا عمل تو اس سے مراد عام ہے خواہ عمل قلب ہو یا عمل جوارح تا کہ اعتقاد اور عبادات داخل ہو جائیں۔ جن لوگوں نے اس کو ایمان کی تعریف میں داخل کیا اور جنہوں نے اس کی نفی کی تو یہ محض اللہ تعالیٰ کے ہاں کے اعتبار سے کی، اسلاف نے کہا کہ ایمان قلبی اعتقاد، زبانی گواہی اور عمل جوارح کا نام ہے اور اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ کمال ایمان کے لئے اعمال شرط ہیں۔ یہیں سے ان کے ایمان کے کم و بیش ہونے کا قول نکلا۔ مرجئہ نے کہا کہ ایمان صرف اعتقاد و اقرار کا نام ہے۔ کرامیہ نے کہا کہ یہ فقط اقرار کا نام ہے۔ معتزلہ نے کہا کہ یہ عمل، اقرار اور اعتقاد کے مجموعے کا نام ہے۔ ان کے اور اسلاف کے درمیان فرق یہ ہے کہ انہوں نے اعمال کو ایمان کی صحت کی شرط بنایا ہے جب کہ اسلاف نے اس کو ایمان کے کمال کی شرط بتلایا ہے، یہ سب کچھ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں کے اعتبار سے ہے جہاں تک ہمارے اعتبار کا تعلق ہے تو ایمان فقط اقرار کو کہتے ہیں۔ جس شخص نے اقرار کر لیا اس پر دنیا میں احکام جاری کئے جائیں گے اور اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا الا یہ کہ اقرار کے ساتھ کوئی ایسا فعل بھی پایا جا رہا ہو جو کفر پر دلالت کرتا ہو جیسے بت کو سجدہ کرنا۔

اہلسنت کے تمام حضرات کا عقیدہ مزید وضاحت کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب کا نظریہ ان سب سے الگ ہے۔ شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس میں ہے۔

ان لاهل القبلة فی الایمان مذاهب الاول انه التصدیق و هو مذهب

الشیخ ابی الحسن الاشعری والا مام ابی منصور الماتریدی و فخر الدین الرازی والقاضی البیضاوی و مختار الشارح و جمهور المحققین و الاقرار عندهم شرط لاجراء الاحکام الثانی انه التصدیق والا قرار و هو مذهب جمهورالفقهاء و مختار المصنف و امامنا الاعظم ابی حنیفة رحمه الله۔..................

السادس انه التصدیق والا قرار والعمل بحیث لا یکون ترك الطاعة مخرجا عن الایمان و هو مذهب اکثر السلف و منهم مالك و الشافعی و احمد رحمهم الله۔ (شرح نبراس ص 399 مطبوعه بندیال سرگودھا)

''اہل قبلہ یعنی مسلمانوں کے ایمان کے بارے میں چند مذاہب ہیں۔

اول یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے یہ شیخ ابوالحسن اشعری، امام ابومنصور ماتریدی، فخر الدین رازی، قاضی بیضاوی علامہ تفتازانی اور جمہور محققین کا مذہب ہے اور اقرار ان کے نزدیک (ان پر مسلمانوں کے) احکام جاری کرنے کے لئے شرط ہے۔

دوم ایمان تصدیق و اقرار کے مجموعے کا نام ہے یہ جمہور فقہاء علامہ نسفی اور ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے............

ششم ایمان تصدیق واقرار اور عمل کے مجموعے کا نام ہے اس طور پر کہ طاعت کے ترک سے ایمان سے نہیں نکلتا یہ اکثر اسلاف کا مذہب ہے جن میں امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ شامل ہیں۔''

اہلسنت میں سے جن حضرات نے عمل کو رکن بتایا ہے انہوں نے اس کو کمال ایمان کا رکن یا اس کی شرط بتایا ہے۔ یہ بات اوپر کے حوالجات سے بھی معلوم ہوئی اور آگے مزید وضاحت سے مذکور ہے۔

علامہ عبدالعزیز پرہاروی لکھتے ہیں:

ولا یخفیٰ ان هذه الوجوه الاربعة انما تقوم حجة علی من یجعل

الطاعات رکنا من حقیقة الایمان بحیث ان تارکها لایکون مومنا ضرورة انتفاء الکل بانتفاء الجزء کما هو رأی المعتزلة و الخوارج لا علی من ذهب الیٰ انها رکن من الایمان الکامل و هو الذی یکون صاحبه غیر مستحق للعذاب بحیث لا یخرج تارکها عن حقیقة الایمان و هو الذی یکون صاحبه ناجیا عن العذاب الابدی کما هو مذهب الشافعی رحمه الله و اهل الحدیث و تحقیق هذا المقام ان السلف و اهل الحدیث جعلوا العمل جزء الایمان ...... لکن هولاء صرحوا بان تارك العمل مومن و هذا مشکل لان انتفاء الجزء یستلزم انتفاء الکل وکان البخاری صاحب الصحیح یبالغ فی ان العمل من الایمان حتیٰ قال کتبت الحدیث عن الف و ثمانین نفساولم اکتب الاعمن قال الایمان قول و عمل و مع ذلك قال فی قوله علیه الصلوة والسلام لایزنی الزانی حین یزنی و هو مؤمن"۔ لا یکون هذا مومنا تاما ولا یکون له نور الایمان انتهی۔ وللعلماء فی توجیه کلامهم وجهان الاول ما اختاره الشارح فی مصنفاته و هو ان الایمان یطلق علیٰ ماهو اساس النجاة عن العذاب المخلد و هو التصدیق وحده اومع الاقرار و علی الکامل المنجی عن کل عذاب و هو التصدیق والا قرار و العمل فالاول مقابل الکفر و الثانی مقابل العصیان الثانی ما اختاره العلامة جلال الدین الدوانی و هوان المعتزلة جعلوا الاعمال جزءا من حقیقة الایمان داخلة فی قوامه فیلزم من عدمها عدمه۔ اما السلف فجعلوها جزءا عرفیة لایلزم من عدمها عدمه کالشعر و الظفر والید والرجل للانسان وکالاوراق والا غصان للشجرة ولا یلزم من انعدام هذه الاجزاء انعدام الانسان و الشجرة۔ فلفظ الایمان عندهم موضوع للقدر المشترك بین التصدیق و بینه وبین الاعمال کما ان المعتبر فی الشجرة المعینة فی العرف هوالقدر المشترك بین ساقها و مجموع ساقها مع الشعب والاوراق فلایحکم بانعدام الایمان مابقی التصدیق کما لا یحکم بانعدام الشجرة ما

بقی ساقھا (شرح نبراس ص 401)

مخفی نہیں ہے کہ یہ چار وجوہ اس شخص کے خلاف دلیل ہیں جو طاعات کو ایمان کی حقیقت کا رکن شمار کرتا ہے۔ اس طور پر کہ ان کا تارک مومن نہیں اس بناء پر کہ یہ بات ضروری ہے کہ جزء کے انتفاء سے کل کا انتفاء ہوتا ہے جیسا کہ معتزلہ اور خوارج کا مذہب ہے، اس شخص کے خلاف دلیل نہیں جس کا مذہب یہ ہے کہ طاعات ایمان کامل کا رکن ہے اور ایمان کامل وہ ہے جس کا مالک عذاب کا مستحق نہیں ہوتا اس طور پر کہ طاعات کا تارک حقیقت ایمان سے نہیں نکلتا اور حقیقت ایمان وہ ہے کہ جس کا صاحب ابدی عذاب سے نجات پاتا ہے جیسا کہ یہ امام شافعی رحمہ اللہ اور اہل حدیث کا مذہب ہے۔
اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ اسلاف اور محدثین نے عمل کو ایمان کا جزء قرار دیا ہے......
لیکن ان لوگوں نے تصریح کر دی کہ تارک عمل مومن ہوتا ہے۔ اس پر اشکال ہے کیونکہ جزء کا انتفاء کل کے انتفاء کو مستلزم ہے نیز امام بخاری رحمہ اللہ خوب زور دیتے ہیں کہ عمل ایمان میں سے ہے یہاں تک کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ایک ہزار اسی اشخاص سے حدیث لکھی اور وہ سب یہی کہتے تھے کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ نبی ﷺ کے ارشاد لا یزنی الزانی حین یزنی و ھو مومن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ مومن تام نہیں ہوگا اور اس کے لئے نور ایمان نہیں ہوگا الخ ان کے کلام کی توجیہ میں علماء نے دو وجہیں بیان کی ہیں اول وہ جس کو شارح نے اپنی تصنیفات میں اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ ایمان کا اطلاق عذاب خلد سے نجات کی اساس پر کیا جاتا ہے اور یہ اساس تنہا تصدیق ہے یا مع اقرار ہے، اور اس ایمان پر بھی کیا جاتا ہے جو کامل ہو اور ہر عذاب سے نجات دینے والا ہو یہ تصدیق واقرار وعمل کا نام ہے، پس اول کفر کا مقابل اور ثانی نافرمانی کا مقابل ہے، ثانی توجیہ وہ ہے جس کو علامہ جلال الدین دوانی نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ معتزلہ نے اعمال کو حقیقت ایمان کا جزء اور اس کے قوام میں داخل مانا لہذا اعمال کے عدم سے ایمان کا عدم لازم آیا، رہے اسلاف تو انہوں نے اعمال کو جزء عرفی قرار دیا ہے جس کے عدم سے ایمان کا عدم لازم نہیں آتا۔ مثل بال، ناخن، ہاتھ اور

پاؤں انسان کے لئے۔ اور پتے اور ٹہنیاں درخت کے لئے۔ ان اجزاء کے انعدام سے انسان و درخت کا انعدام لازم نہیں آتا پس ان کے نزدیک ایمان کا لفظ تصدیق اور تصدیق واعمال کے مابین قدر مشترک کے لئے وضع کیا گیا ہے جیسا کہ معین درخت میں عرف ورواج میں اعتبار اس قدر مشترک کا ہے جو اس کے تنے اور اس کے تنے، ٹہنیوں و پتوں کے مجموعے کے مابین ہے لہٰذا ایمان کے انعدام کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جائے گا جب تک کہ تصدیق باقی ہے جیسا کہ درخت کے انعدام کا حکم نہیں لگایا جاتا جب تک کہ تنا باقی ہو۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کے تصدیق قلبی اور عمل کے مابین تلازم پر استدلال کا جواب

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

التصديق هوالاذعان عندالحكماء و هو اما ادراك او من لواحق الادراك والحق عندى هو الثانى ثم التصديق قد يجتمع مع الجحود ايضا و هو كفر قطعاً قال تعالى "وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما و علوا" و قال تعالىٰ ايضاً۔ يعرفونه كما يعرفون ابناء هم" وقال تعالىٰ "فلما جاء هم ماعرفوا كفروا به"۔

فانظر كيف اجتمع اليقين والا ذعان۔ و المعرفة مع الجحود۔

وهذا هرقل عظيم الروم يقول لوأنى اعلم انى اخلص اليه لتجشمت لقاء ه ولو كنت عنده لغسلت عن قدميه۔ و فى فتح البارى عن مرسل ابن اسحق عن بعض اهل العلم ان هرقل قال ويحك والله انى لاعلم انه نبى مرسل ولكنى اخاف الروم على نفسى ولولا ذلك لا تبعته۔

حکماء کے نزدیک تصدیق اذعان کو کہتے ہیں اور یہ یا تو ادراک ہے یا لواحق ادراک میں سے ہے اور میرے نزدیک دوسری بات ہی حق ہے پھر تصدیق کبھی انکار کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے اور یہ قطعی کفر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے اور انہوں نے اس کا انکار کیا حالانکہ ان کے نفس اس پر یقین رکھتے تھے ظلم اور تکبر کی وجہ سے۔ نیز ارشاد باری

تعالیٰ ہے وہ آپ کو ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ نیز ارشاد ہے جب ان کے پاس وہ چیز آئی جس کو وہ پہچانتے تھے تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ دیکھو کیسے اذعان و یقین و معرفت کا اجتماع انکار کے ساتھ ہو گیا۔ ہرقل عظیم روم کہتا ہے اگر میں جانتا کہ میں ان تک پہنچ سکتا ہوں تو ان کی ملاقات کے لئے تکلیف اٹھاتا اور اگر میں ان کے (یعنی رسول اللہ ﷺ) پاس ہوتا تو ان کے قدم دھوتا۔ بعض اہل علم مرسل ابن اسحٰق سے نقل کرتے ہیں کہ ہرقل نے کہا کہ تیری ہلاکت ہو اللہ کی قسم میں خوب جانتا ہوں کہ وہ نبی مرسل ہیں لیکن میں روم سے اپنے بارے میں ڈرتا ہوں۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا تو میں ان رسول کی ضرور پیروی کرتا۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے تلازم پر جن حدیثوں سے استدلال کیا ان کے بارے میں ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

واصحابنا اولوه بان المراد المومن الكامل فی ایمانه او ذو امن من عذاب الله تعالیٰ او المراد المومن المطیع لله یقال امن له اذا انقاد و اطاع او معناه الزجر والوعید او الانذار لمرتكب هذه الكبائر بسوء العاقبة اذ مرتكبها لا یومن علیه ان یقع فی الكفر الذی هو ضد الایمان۔

ہمارے اصحاب نے اس حدیث کا یہ مطلب بتایا کہ مراد وہ مومن ہے جو کامل الایمان ہو یا جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن میں ہو یا وہ مومن ہے جو اللہ کا اطاعت گزار ہو جب انقیاد و اطاعت اختیار کرے تو کہتے ہیں آمن له یا اس سے مراد زجر و وعید ہے یا ان کبائر کے مرتکب کے لئے ڈراوا ہے برے انجام کا کیونکہ کبائر کے مرتکب پر اس سے امن نہیں ہوتا کہ کہیں وہ ایمان کی ضد کفر میں جا پڑے۔

عکرمہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جب لایزنی الزانی و هو مومن والی روایت سنی تو پوچھا کیف ینزع الایمان منه (اس سے ایمان کیسے نکال لیا جاتا ہے؟) تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا هكذا وشبك بين اصابعه ثم

اخرجها فان تاب عاد اليه هكذا وشبك بين اصابعه (اس طرح اور انہوں نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان داخل کر دیں۔ پھر ان کو نکال لیا اور فرمایا پھر اگر وہ توبہ کرے تو ایمان اس کی طرف دوبارہ اس طرح لوٹ آتا ہے اور دوبارہ اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کر دیں۔)

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مومن تام نہیں ہوگا اور اس کے لئے نور ایمان نہیں ہوگا۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ظاهر كلامه ان الايمان يخرج عن مرتكب هذه الاشياء حين الارتكاب ولا يعود اليه الا بالتوبة و هو غير مستقيم على قواعد اهل السنة۔ فالتاويل ان كمال الايمان و نوره و ثمرته و نتيجته من الحياء والخوف و الرحمة والشفقة والديانة تفارقه فی تلك الحالة۔ والتائب من الذنب كمن لا ذنب له و ينصره قول الحسن البصری ان المعنی ينزع عنه اسم المدح الذی يسمی به اولياؤه المومنون و يستحق الذم فيقال سارق و زان و فاسق۔

ان کا ظاہر کلام یہ ہے کہ ان کاموں کے مرتکب سے ارتکاب کے وقت ایمان نکل جاتا ہے اور پھر توبہ کرنے ہی سے واپس آتا ہے لیکن یہ بات اہلسنت کے قواعد کے موافق نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی تاویل یہ ہے کہ ایمان کا کمال اور اس کا نور اور اس کا ثمرہ و نتیجہ مثلاً حیاء خوف، رحمت، شفقت اور دیانت اس سے اس حالت میں علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اور گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی مانند ہوتا ہے اس کی تائید حسن بصری رحمہ اللہ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اس سے مومن جیسا قابل تعریف نام جو اللہ کے ولیوں کا ہوتا ہے کھینچ لیا جاتا ہے اور وہ قابل مذمت نام مثلاً چور، زانی اور فاسق کا مستحق بن جاتا ہے۔

باب: 4

ڈاکٹر اسرار صاحب کا اہلسنت کے خلاف عقیدہ کہ کسی گناہ پر اصرار ہمیشہ کے لئے جہنمی بنا تا ہے

اوپر جس ZERO VALUE کا ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر اسرار صاحب کہتے ہیں:

''اگر چہ قانون تو یہی بنتا ہے کہ اگر ایمان نہیں تو اطاعت قبول نہ ہو لیکن اللہ اپنی شان غفاری و رحیمی کی وجہ سے قبول کر لیتے ہیں''

''لیکن اللہ اور اس کے رسول کی یہ اطاعت کلی ہو جزوی نہ ہو۔ الا یہ کہ کسی وقت جذبات و ہیجان میں مبتلا ہو کر کوئی لغزش ہو جائے اور نہایت پشیمانی کے ساتھ رجوع کرے توبہ کرے تو اور بات ہے۔ اللہ نے اس کی توبہ کو قبول کرنے کا ذمہ لیا۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ۔ (سورہ نساء: 17)

اس کے مقابلے میں ایک معصیت سوچ سمجھ کر CALCULATIONS کر کے مستقل ڈیرا ڈال کر کی تو ایسا ایک گناہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنمی بنانے کے لئے کافی ہے۔ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ أَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ۔ ''وہ گناہ جو انسان کا احاطہ کرے وہ معاشی گناہ ہے کیونکہ یہ اکل حرام ہے جو ریشے ریشے میں سرایت کر جاتا ہے۔'' (کیسٹ حقیقت و ماہیت ایمان) (کیسٹ ایمان اور اسلام)

ہم کہتے ہیں کہ:

یہاں ڈاکٹر اسرار صاحب کے اس نکتے سے بحث مقصود ہے کہ ایک معصیت سوچ سمجھ کر مستقل ڈیرا ڈال کر کی تو ایسا ایک گناہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنمی بنانے کے لئے

کافی ہے''

اگر تو ''سوچ سمجھ کر مستقل ڈیرا ڈال کر'' سے مراد یہ ہے کہ وہ اس معصیت کے جائز اور حلال ہونے کا اعتقاد کر لیتا ہے یا شریعت کے حکم کو استخفاف و استہزاء کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ تو کفر ہے اور اس کفر کی بدولت وہ ہمیشہ کا جہنمی ہوگا۔

اور اگر مراد حلت کے اعتقاد اور استخفاف کے بغیر ہی وہ کسی معصیت کا برابر ارتکاب کئے جاتا ہے اور دل میں کفر نہیں آیا تو اگر چہ ڈاکٹر صاحب کے قاعدے کے مطابق وہ ہمیشہ کا جہنمی ہوگا کیونکہ ڈاکٹر اسرار صاحب ایمان تو اس کے دل میں مانتے ہی نہیں۔ نفاق نہ ہونے کی وجہ سے اللہ نے اس کے اسلام کو اطاعت کلی کی شرط کے ساتھ قبول کیا تھا۔ اطاعت کلی پائی نہیں گئی کیونکہ معصیت کا ارتکاب یہاں کسی وقتی ہیجان کے زیر اثر نہیں، بلکہ سوچ سمجھ کر ہے، لہٰذا وہ اسلام بھی مقبول نہیں رہا اور وہ ہمیشہ کا جہنمی بن گیا۔ لیکن اہل سنت کا عقیدہ اس سے مختلف ہے۔

آدمی کا کسی معصیت پر اصرار کرنے سے ہوسکتا ہے کہ ترقی کرتے کرتے اس کو کفر تک لے جائے لیکن اہلسنت کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک اس کے اندر کفر نہیں آ جاتا اس کے اندر جو ایمان و تصدیق ہے اس کی وجہ سے وہ آخر کار جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

آگے دو حدیثیں مذکور ہیں جن سے ڈاکٹر اسرار صاحب کے عقیدہ کا باطل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

عن ابی ذر قال اتیت النبیﷺ و علیه ثوب ابیض و هو نائم ثم اتیته و قد استیقظ فقال ما من عبد قال لا اِله الا اللّٰه ثم مات علی ذالك الا دخل الجنة قلت و ان زنٰی وان سرق قال و ان زنی و ان سرق قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی و ان سرق قلت و ان زنی وان سرق قال وان زنی و ان سرق علیٰ رغم انف ابی ذر۔

ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے پاس آیا تو آپ ایک سفید کپڑا اوڑھے سوئے ہوئے تھے۔ میں دوبارہ آیا تو آپ جاگ چکے تھے آپ نے فرمایا جو بندہ

بھی لا الٰہ الا اللہ کہے پھر اس پر مر جائے تو جنت میں داخل ہو گا۔ میں نے کہا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو، اگرچہ اس نے چوری کی ہو آپ نے فرمایا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو، اگرچہ اس نے چوری کی ہو۔ میں نے کہا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ نے فرمایا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو میں نے پوچھا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ نے فرمایا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو، اگرچہ اس نے چوری کی ہو ابوذر کی ناک خاک آلود ہونے کے باوجود۔

"الادخل الجنة" کے قول کے تحت ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ففيه بشارة الىٰ ان عاقبته دخول الجنة و ان كان له ذنوب جمة لكن امره الى الله ان شاء عفا عنه و ادخله الجنة و ان شاء عذبه بقدر ذنبه ثم ادخله الجنة۔ (مرقات شرح مشكوة)

''اس میں بشارت ہے کہ انجام کار جنت میں داخلہ ہوگا اگرچہ اس کے گناہ کثیر ہوں لیکن اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر ہوگا، چاہیں گے تو اس کو معاف فرما کر جنت میں داخل فرمائیں گے اور چاہیں گے تو اس کو اس کے گناہوں کے بقدر عذاب دیں گے پھر اس کو جنت میں داخل کریں گے۔''

نیز اس حدیث میں ایسی کوئی قید نہیں کہ جس سے معلوم ہو کہ یہ زنا اور سرقہ وہ ہے جو وقتی ہیجان کے باعث ہو گیا ہو نہ کہ وہ جو سوچ سمجھ کر کیا گیا ہو۔ نہ ہی یہ کہیں مذکور ہے کہ اس معصیت کا ارتکاب اتفاقیہ کبھی ہو گیا ہو نہ کہ اصرار اور تکرار کے ساتھ۔ پھر یہ کہ زنا اور سرقہ دونوں ہی ایسی معصیتیں ہیں جو عام طور پر سوچ سمجھ کر کی جاتی ہیں اور جن سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی یقیناً حرام ہے۔ اکل حرام کے باوجود حدیث سے اس بات کا امکان ملتا ہے کہ اس کو موت لا الہٰ الا اللہ پر آئے یعنی یہ تصدیق اس کے دل میں موجود ہو۔

حدثنی سوید بن سعید ...... عن ابی سعید الخدری رضی الله عنه......

فیقول الله تعالیٰ شفعت الملائكة و شفع النبيون و شفع المومنون ولم يبق الا ارحم الراحمين فيقبض قبضة من النار فيخرج منها قوما لم يعملوا قط قد عادوا

حمما فيلقيهم فى نهر فى افواه الجنة يقال له نهر الحياة فيخرجون كما تخرج الحبة فى حميل السيل الا ترونها تكون الى الحجر او الى الشجر مايكون الى الشمس اصيفر و اُخَيضر و مايكون منها الى الظل يكون ابيض فقالوا يا رسول الله كانك كنت ترعى بالبادية قال فيخرجون كا للؤلؤ فى رقابهم الخواتيم يعرفهم اهل الجنة هولاء عتقاء الله الذين ادخلهم الله الجنة بغير عمل عملوه ولا خير قدموه۔ (مسلم شريف ج 1 ص 102 ، درسى)

''اللہ تعالیٰ فرمائیں گے فرشتوں نے شفاعت کی اور انبیاء نے شفاعت کی، اور مومنوں نے شفاعت کی اور نہیں باقی رہا مگر ارحم الراحمین۔ پس اللہ تعالیٰ جہنم میں سے ایک مٹھی ایسے لوگوں کی نکالیں گے جنہوں نے کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا ہو گا۔ وہ کوئلہ ہو چکے ہوں گے پھر ان کو جنت کے اوائل میں ایک نہر میں ڈال دیں گے اس کو نہر حیات کہا جاتا ہے پھر وہ نکلیں گے (نہر سے) جیسا کہ دانہ نکلتا ہے سیلاب کے محمول میں۔ کیا تم اس کو نہیں دیکھتے ہو کہ وہ حجر یا شجر کی جانب ہوتا ہے تو جو سورج کی جانب ہوتا ہے وہ زرد اور سبز رنگ کا ہوتا ہے اور جو ان میں سے سائے میں ہوتا ہے وہ سفید ہوتا ہے صحابہ نے کہا یا رسول اللہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جنگل میں چراتے تھے، آپ نے فرمایا پس وہ مثل موتیوں کے نکلیں گے ان کی گردنوں میں مہریں ہوں گی اہل جنت میں ان کی یہ پہچان ہو گی کہ یہ اللہ کے وہ آزاد کردہ ہیں جن کو اللہ نے جنت میں بغیر ان کے کسی عمل کے جو انہوں نے کیا ہو اور بغیر کسی بھلائی کے جو انہوں نے آگے بھیجی ہو (جنت میں) داخل کیا۔''

اب جس شخص نے کبھی کوئی نیک عمل نہ کیا ہو اس کے بارے میں یہ تصور کرنا چنداں مشکل نہیں کہ اس کا معاصی پر اصرار تھا اور اکل حرام پر دوام تھا (کیونکہ اکل حلال کو طلب کرنا تو خود ایک نیک عمل ہے) جب ایسے شخص کی بھی آخر کار نجات ہو سکتی ہے تو پھر کیا ڈاکٹر صاحب کے تمام دعاوی اور ان کی تمام تحقیقات اور ان کے تمام دلائل بیکار نہیں ہو جاتے؟

باب: 5

ڈاکٹر اسرار صاحب کے نزدیک ڈارون کا قرآن وحدیث کے مخالف نظریہ ارتقاء درست ہے

نظریہ ارتقاء کے قائلین کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اس طرح نہیں ہوئی کہ پہلے مٹی گارے سے ان کا پتلا بنایا گیا ہو پھر اس میں روح پھونکی گئی ہو بلکہ ان کے نزدیک آدم اور حواء علیہا السلام انسانوں سے مشابہ بندروں کی اولاد تھے اور بندر بھی ہمیشہ سے بندر نہیں تھے بلکہ وہ اس سے پہلے کمتر درجے میں تھے۔ ان کے نزدیک دنیا میں حیات کی ابتداء یکخلیاتی (UNICELLULAR) صورت میں شروع ہوئی جو کروڑوں اربوں سالوں میں مختلف جانداروں میں ارتقائی منازل طے کر کے انسان تک پہنچی۔ یہ نظریہ محض ایک مفروضہ ہے اور پہلے خیال تھا کہ حیات کا ابتدائی مظہر امیبا (AMOEBA) ہے لیکن نظریہ ارتقاء والوں کی سوچ مزید ترقی کر کے امیبا سے آگے نکل کر وائرس (VIRUS) تک پہنچ گئی ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کی ایک ریکارڈ شدہ تقریر ''قرآن اور نظریہ ارتقاء'' کے نام سے دستیاب ہے۔ اس تقریر میں نظریہ ارتقاء کو قبول کرتے ہوئے:

1۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے قرآن پاک کے ان الفاظ سے استدلال کیا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ۔ مِنْ طِينٍ لَازِبٍ۔ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَسْنُونٍ۔

ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آخر کہیں تراب اور کہیں طین اور کہیں طین لازب اور کبھی صلصال کا ذکر ہے تو اس میں کسی بات کی طرف اشارہ ہے پھر یہ نتیجہ نکالا کہ کیچڑ سوکھی اور مٹی کھنکھنانے لگی یعنی اس میں خمیر پیدا ہوا اور اس طرح سے پہلا ذی حیات امیبا AMOEBA وجود میں آیا اور امیبا عام طور پر جوہڑوں اور

تالابوں میں پایا جاتا ہے۔

2- وہ کہتے ہیں کہ اسلامی ادب میں بھی اس کی طرف اشارات موجود ہیں مثلاً مثنوی مولانا روم میں ہے۔

آمدہ اول باقلیم جماد — وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یا دنا ورد ازنبرد
وز نباتی چوں بحیوانی فتاد — نامدش حال نباتی، ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوی آں — خاصہ در وقت بہار و ضیمراں
باز از حیواں سوی انسانیش — می کشد آں خالقے کہ دانیش

3- وہ کہتے ہیں کہ انسان کا مبداء دنیوی معاملہ ہے اور حدیث أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ کی وجہ سے اس کی تعیین ہم اپنی سمجھ بوجھ اور اپنی تحقیقات سے کر سکتے ہیں۔

کچھ کہنے سے پیشتر بہتر ہوگا کہ ہم اس نظریہ کی حیثیت اور حقیقت پر نظر ڈال لیں۔ زمین پر حیات کی ابتداء کب ہوئی؟ ذی حیات اجسام کس شکل کے تھے۔ اور آیا وہ اب بھی باقی ہیں یا ان میں انقلابات آ چکے ہیں۔ یہ چند سوالات ہیں جن کا جواب دینے کی ایک کوشش ڈارون اور دوسرے علمائے حیاتیات نے کی ہے۔ ابھی تک اس کو ایک مفروضہ کی حیثیت حاصل ہے جس کو ہم اصطلاحاً وہم کہہ سکتے ہیں (یعنی جانب مرجوح) تفصیل کے لئے دیکھئے F.Sc میں داخل نصاب کتاب BIOLOGICAL SCIENCE جس کے متعلقہ اقتباسات کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

ایک ماہر حیاتیات ان سوالات کا مطالعہ کس طرح کر سکتا ہے۔ زمین پر حیات کی ابتداء کب ہوئی تھی؟ سب سے ابتدائی جاندار کس طرح کے تھے؟ کیا ابتدائی جانداروں میں سے اب تک کچھ باقی ہیں یا وہ تبدیل ہو گئے اور ان کی جگہ کچھ اور جانداروں نے لے لی ہے؟

اس بارے میں اب تک بہت سے مشکل سوالات اٹھائے جا چکے ہیں اور ہر معاملے میں ہم ایسے نتائج تک پہنچے ہیں جن کے لئے مشاہدہ و تجربہ کا اچھا

خاصا مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔لیکن مبداء حیات کے بارے میں سوالات کا معاملہ ایسا نہیں ہے اور اسی وجہ سے ماہرین حیاتیات کو شبہ ہے کہ شاید زمین پر حیات کی ابتداء بہت قدیم زمانے میں ہوئی ہوگی۔ یہ تو بلاشبہ ناممکن ہے کہ ان واقعات کا مطالعہ کیا جا سکے جو ایک بہت زمانہ پیشتر وقوع پذیر ہوئے تھے۔ کیونکہ ماہرین حیاتیات تو لاکھوں سال کی تاخیر سے جائے وقوع پر وارد ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ جو وہ کر سکتے ہیں یہ ہے کہ ایسے طریقے تجویز کریں جن سے شاید حیات کی ابتداء ہوئی ہو۔

''ہائمین کا قول ہے کہ ایک خلیہ جاندار سے کثیر الخلیہ جاندار کی آفرینش کا کوئی براہ راست ثبوت نہیں ہے۔ پھر بھی کثیر الخلیہ جانداروں کی آفرینش کے بارے میں بحث اسی سوال کے گرد گھومتی رہتی ہے کہ کونسا یک خلیہ جاندار کثیر الخلیہ جانداروں کا غالباً مبداء بنا ہوگا دو وسیع احتمالات موجود ہیں جن کے تحت شاید کثیر الخلیہ جانداروں نے یک خلیہ جانداروں سے وجود حاصل کیا ہوگا۔

اس مسئلے میں زمانہ قدیم کے حیوانات و نباتات کا علم یعنی PALEONTOLGY بھی کوئی مدد نہیں دے سکتا کیونکہ کیمبرین (CAMBRIAN) دور کی ابتداء میں کثیر الخلیہ جاندار پوری طرح مستحکم ہو چکے تھے لہٰذا اغلب یہ ہے کہ کثیر الخلیہ جانداروں کی ابتداء ہمیشہ تخمینی رہے گی۔لیکن بہت سے ماہرین حیوانات کی رائے یہ ہے کہ کثیر الخلیہ جاندار فلیجلا سے وجود میں آئے ۔ ان کی اس رائے کی کئی وجوہات ہیں۔لیکن اس گمان وتخمین SPECULATION کا مبنیٰ وہ مشاہدات اور تجربات ہیں جن کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف انتقال ہے۔

''ایسی بہت سی مثالیں اب معلوم ہیں جن میں دارومدار ذوق پر ہے کہ دو ممتاز گروہوں کو مکمل انواع قرار دیا جائے یا ان کو ایک نوع کی اصناف قرار دیا جائے ۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ مثالیں ہیں جن میں جغرافیائی

اصناف کے دونوں سرے ایک جگہ پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں باہمی تناسل یا تو سرے سے نہیں ہوتا یا مکمل طور پر نہیں ہوتا۔اس لئے ان کے بارے میں یہ خیال قائم کیا جا سکتا ہے کہ وہ مختلف انواع بن چکی ہیں''۔

اس کی عمدہ مثال وہ ہے جو BIOLOGICAL SCIENCE کے صفحہ 600 پر درج ہے۔

''جغرافیائی تفریق کے ارتقائے انواع کے ساتھ تعلقات کی ایک واضح تصویر اس سے حاصل ہوتی ہے جس کو نسلوں کا دائرہ کہا جاتا ہے مثلاً جنوبی کیلیفورنیا کے ساحلی علاقوں میں ایک چھپکلی پائی جاتی ہے جو ہلکے لیکن ایک جیسے رنگ کی ہوتی ہے کچھ شمال کی جانب نسبتاً گہرے رنگ کی نسل پائی جاتی ہے۔ مزید شمال کی طرف اس سے بھی زیادہ گہرے رنگ کی نسل پائی جاتی ہے لیکن اس کا رنگ بھی ایک جیسا ہوتا ہے اور یہ ساحل سے لے کر اندر تک پائی جاتی ہے لیکن اور اندرونی علاقوں میں جنوب مشرقی جانب ایسی نسل پائی جاتی ہے جس پر دھبے پڑے ہوئے ہیں۔مزید جنوب کی جانب ساحلی علاقے سے خشک و گرم وادی کو پار کر کے سیرا نواڈا میں یہ دھبے مختلف قسم کے دھبوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔آخر میں یہ دائرہ ایک اور نسل پر جا کر مکمل ہو جاتا ہے۔ جو زیادہ واضح دھبوں پر مشتمل ہے اور یہیں اس دائرے کا پہلا سرا بھی جو جنوبی کیلیفورنیا کے یک رنگی قسم پر مشتمل تھا پایا جاتا ہے۔ فرض کر لو کہ مذکورہ جغرافیائی دائرہ میں ترتیب سے پائی جانے والی ان نسلوں کے یا ان اصناف کے نام ا، ب، ج، د، س اور ش ہیں ۔ا، اور ب جہاں کہیں اکٹھے پائے جاتے ہیں ان میں باہمی تناسل پایا جاتا ہے۔اسی طرح ب اور ج میں اور ج اور د میں، د اور س میں اور س و ش کے مابین بھی باہمی تناسل موجود ہے لیکن ہماری حیرت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ چیزیں جو کسی ایک متعین چیز کے مساوی ہیں ارتقاء میں ان میں آپس میں مساوات نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ ا اور ش جہاں یہ ایک علاقے میں اکٹھے ہو جاتے ہیں آپس میں

تناسل نہیں رکھتے یا بہت کم رکھتے ہیں۔ اگر کوئی قدرتی آفت ب سے لے کر س تک کی اصناف کو تباہ و معدوم کر دے تو ا اور ش بجائے ایک کے دو مختلف انواع قرار دی جانے لگیں‘‘۔

اس مثال سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ یہ درحقیقت ایک نوع ہی کی اصناف SUB-SPECIES ہیں نہ کہ علیحدہ علیحدہ انواع۔ لیکن جو لوگ ان کو علیحدہ انواع شمار کرتے ہیں ان کے نزدیک وجہ یہ ہے کہ:۔

’’اگر دو آبادیوں میں بہت حد تک مشاکلت پائی جاتی ہو پھر بھی ان کو دو مختلف انواع کی طرف تفویض کریں گے جب تک کہ ان کے درمیان کامیاب تناسل نہ ہو اور وہ طاقتور اور زرخیز اولاد نہ جنیں‘‘۔

اگرچہ یہ علم حیاتیات کی ایک اصطلاح کا معاملہ ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ اختلاف انواع کے لئے کوئی حقیقی معیار نہیں۔ کیونکہ مختلف ماحول میں رہنے کی وجہ سے عادت میں اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اور یہ چیز ان کی قدرتی جفتی میں کلی یا جزوی مانع بن سکتی ہے۔

ارتقاء کے مجوز ماہرین حیاتیات کے نزدیک حیات کی ابتداء وائرس VIRUS سے ہوئی ہے۔ وائرس کی دریافت سے پہلے امیبا AMOEBA کو ابتدائی مظہر سمجھا جاتا تھا لیکن اب وائرس کی سادہ تر ترکیب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو یہ مقام دیا گیا ہے۔

’’امیبا سے انسان تک‘‘ کی تعبیر عام طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ گویا کہ یہ ارتقاء کی عظیم وسعت کو محیط ہے لیکن یہ درست نہیں کیونکہ امیبا سے بھی مقدم تر حیات کے ابتدائی مراتب کا وسیع میدان موجود ہے۔ یک خلیاتی جانداروں میں فلیجلا اب پوری دنیا میں امیبا کی جنس رھائی زو پوڈا کے مقابلے میں قدیم تر مانی جاتی ہے اور غالباً امیبا کے اجداد میں سے ہے۔ بلاشبہ بہت سے فلیجلا مثلاً یوگلینا سبزہ مادہ (کلوروفل) اور دیگر نباتاتی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور اس طرح وہ عالم حیوانات اور عالم نباتات کے درمیان ایک کڑی مہیا کرتے ہیں۔ لیکن فلیجلا خود، انتہائی پیچیدہ جاندار ہیں کہ ان کو میدان حیات کا نقطہ آغاز تسلیم

کرنا دشوار ہے۔ سائنی فائٹا نیلگوں سبز ایلجی اس سے بھی زیادہ ابتدائی ہیں۔ ان میں مرکزہ اور سائٹو پلازم کی مخصوص تفریق موجود ہے لیکن کروماٹن پورے خلیے میں منتشر ہوتا ہے۔ لیکن یہ جاندار بھی بیکٹیریا یعنی جراثیم کے مقابلے میں خاصے ترقی یافتہ ہیں کیونکہ نیلگوں سبز ایلجی کلوروفل کی کیٹالیٹک (Catalytic) خصوصیات کی بناء پر سورج کی روشنی میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی سے شکر بناتے ہیں اس کے باوجود جراثیم کو مشکل ہی سے سادہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان کے پروٹو پلازم کا کیمیائی تجزیہ اس نتیجہ سے زیادہ مختلف نہیں جو کہ اونچے درجے کے حیوانی یا نباتاتی پروٹو پلازم کے تجزیے سے حاصل ہوتا ہے ان کی ساخت اور کالونی کی خصوصیات اتنی نمایاں ہوتی ہیں کہ یہ بہت چھوٹے جراثیم میں بھی شناخت کا کام دیتی ہیں لیکن بیماری کی موجب کچھ اور چیزیں ہیں جو انتہائی باریک فلٹر (چھلنی) میں سے بھی گزر جاتے ہیں، یہ وائرس کہلاتے ہیں وائرس کی قلمیں بھی بنائی گئی ہیں اور یہ قلمیں نیوکلو پروٹین ہیں جو کہ مخصوص پروٹو پلازم کے مقابلے میں انتہائی سادہ ہیں لیکن جب ان کا تقابل غیر نامیاتی یا بہت سے نامیاتی مالیکیول سے کیا جائے تو بہت پیچیدہ نظر آتے ہیں۔‘‘

پھر ماہرین حیات کے نزدیک وائرس کا وجود مٹی، کیچڑ یا کھنکھناتی مٹی کا بھی محتاج نہیں تھا:

’’اور اس لئے یہ عمل شروع ہو گیا ہو گا۔ ابتدائی فضائی گیس برق اور ماورائے بنفشی روشنی کی موجودگی میں متحد ہو کر سادہ نامیاتی مرکبات میں تبدیل ہو گئی ہو گی جوں جوں زمین ٹھنڈی ہوتی گئی آبی بخارات جمع کر تالاب، دریا اور سمندروں میں منتقل ہو گئے ہوں گے۔ سادہ نامیاتی مواد ان پانیوں میں لاکھوں سالوں میں جمع ہوتے گئے ہوں گے اس یخنی کے مرکبات کے بارے میں توقع کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے میں عمل کر کے مختلف کیمیائی چیزیں بنائی ہوں گی۔ ہم یہ فرض کر چکے ہیں حیات کی ابتدائی صورتوں نے ان محیط سمندر کے نامیاتی مرکبات کو اپنی زندگی اور تناسل کے لئے

استعمال کیا ہوگا۔

اس سارے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1- نظریہ ارتقاء ابھی تک محض ایک مفروضہ اور قیاس آرائی ہے۔ اور اگر چہ اس کے لئے کچھ شواہد بھی ذکر کئے گئے ہیں لیکن وہ خود کامل اور تام نہیں۔ خصوصاً عالم حیوانات اور اس میں بھی بالخصوص انسان کے بارے میں تو یہ ابھی مفروضہ اور قیاس آرائی سے کچھ زیادہ نہیں۔

2- حیات کی ابتداوائرس سے ہوئی جس کے وجود کے لئے مٹی وغیرہ کی حاجت نہیں تھی۔ محض ایک مفروضہ اور وہ بھی جو متروک ہو گیا ہو اس کی بنیاد پر قرآن وحدیث کی تصریحات کو نظر انداز کرنا اور بلاوجہ دور از کار تاویلات کرنا ڈاکٹر اسرار صاحب کی بڑی زیادتی ہے جس میں وہ کسی بھی درجہ میں معذور نہیں ٹھہرتے۔

نظریہ ارتقاء قرآن وحدیث کی واضح تصریحات میں باطل ہے

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ (سورہ آل عمران: 59)

بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال جیسی ہے۔ اللہ نے پیدا کیا آدم کو مٹی سے۔

علامہ رازیؒ فرماتے ہیں:

اجمع المفسرون علیٰ ان هذه الأیة نزلت عند حضور وفد نجران علی الرسول ﷺ و کان من جملة شبهھم انهم قالوا یا محمد لما سلمت انه لا اب له من البشر وجب ان یکون ابوه هو اللّٰه تعالیٰ فقال ان آدم ما کان له اب ولا ام ولم یلزم ان یکون ابنا للّٰه تعالیٰ فکذا القول فی عیسیٰ علیه السلام (تفسیر کبیر)

مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نجران کے وفد کے حضور ﷺ کے پاس آنے کے وقت نازل ہوئی۔ ان کے شبہات میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ اے محمد جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بشری والد نہ تھے تو لازم آیا کہ ان کے والد اللہ تعالیٰ ہوں تو آپ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کے نہ باپ تھے نہ ماں

ان کے لئے یہ لازم نہیں ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہوں تو ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں (کیسے لازم ہو گیا کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہوں)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے پر اتفاق تھا۔ ان کی پیدائش کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے ساتھ تشبیہ دی گئی کہ ان کا بغیر باپ کے ہونا ایسا ہی ہے جیسے آدم علیہ السلام کا بغیر باپ (اور ماں) کے ہونا۔

جب اس آیت کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام کے ماں باپ نہ تھے تو نظریہ ارتقاء باطل ہوا کیونکہ اس نظریہ کی رو سے ان کے ماں باپ دونوں ہونے چاہئیں۔

2- وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِیۡنٍ

اور انسان کی پیدائش گارے سے شروع کی پھر اس کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی نطفہ سے بنایا۔ (سورہ سجدہ: 8)

الانسان میں لام عہد کا ہے اور مراد خاص آدم علیہ السلام ہیں۔ یہ لام جنس کا نہیں ہے کیونکہ آگے فرمایا ''اس کی نسل'' جب کہ جنس تو محض ایک عقلی مفہوم ہوتا ہے اس کی نسل نہیں ہوتی۔ اس آیت میں بتایا کہ آدم علیہ السلام کو گارے سے بنایا اور ان کی نسل کی تخلیق نطفہ سے کی۔ یعنی دونوں کی تخلیق جدا جدا طریقے سے ہوئی جب کہ نظریہ ارتقاء کو تسلیم کیا جائے تو آدم علیہ السلام کا بھی نطفہ سے پیدا ہونا ضروری ہے۔

ثُمَّ کا لفظ مؤخر ہونے کا معنی دیتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی اولاد کو نطفہ سے پیدا کیا۔

اسی سے معلوم ہوا کہ حضرت حوا علیہا السلام بھی نطفہ سے پیدا نہیں ہوئیں جب کہ نظریہ ارتقاء کے مطابق وہ بھی نطفہ سے پیدا ہوئیں۔

3- یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّ نِسَآءً (سورہ نساء: 1)

اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اسی جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں

پھیلا دیں۔

اس آیت میں لفظ منھا کی ضمیر سے مراد نفس واحدہ ہے اور منھما کی ضمیر سے مراد نفس واحدہ اور اس کا زوج (جوڑا) مراد ہے اور ان دونوں سے ان کی اولاد و نسل پھیلائی جو بہت سے مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے۔ ان دو کا مصداق آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام ہیں۔ پھر اسی آیت سے معلوم ہوا کہ حوا علیہا السلام کی تخلیق آدم علیہ السلام سے ہوئی۔

نظریہ ارتقاء والے نفس واحدہ سے ایسا مراد لیں اور یہ کہیں کہ آگے کے ارتقائی مراحل میں جا کر کہیں نر اور مادہ میں تفریق ہوئی اور پھر جب وہ انسانی صورت میں متشکل ہو گئے تو ان سے بہت سے انسان پیدا کئے۔ یہ وہ دور از کار تاویلات ہیں الفاظ جن کا کسی طور سے ساتھ نہیں دیتے۔ پھر تاویل کرنے کی کوئی مجبوری بھی تو ہو جو عقائد میں کسی شرعی یا عقلی محال کے لازم آنے سے ہوتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ابتداء مٹی کے پتلے سے مانی جائے تو نہ کوئی شرعی محال لازم آتا ہے اور نہ کوئی عقلی محال لازم آتا ہے۔

4- صحیح مسلم کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لما صور الله آدم فی الجنة ترکه ماشاء الله ان یترکه فجعل ابلیس یطیف به فینظر ما هو فلما راه اجوف عرف انه خلق خلقا لا یتمالك۔

جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں آدم کی صورت بنائی تو جب تک چاہا اس کو (یونہی) چھوڑے رکھا۔ ابلیس اس کے گرد گھومنے لگا کہ دیکھے یہ کیا ہے؟ جب دیکھا کہ یہ اندر سے کھوکھلا ہے تو جان لیا کہ ان کو ایسے پیدا کیا ہے کہ ان میں ثبات نہیں ہے۔

غرض ارتقائی طریقہ سے تخلیق انسانی کا نظریہ اور عقیدہ قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہے۔

II- ڈاکٹر اسرار صاحب نے جن الفاظ قرآنی سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا فائدہ اور مطلب اس صورت میں بھی نکلتا ہے جب ہم آدم علیہ السلام کی تخلیق کا قرآنی عقیدہ مانیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سورہ حجر کے تفسیری حاشیہ پر مختلف الفاظ کے استعمال

کے فوائد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

آدمی کی پیدائش کے متعلق یہاں دو لفظ فرمائے "صَلْصَالٍ" بجنے والی کھنکھناتی مٹی جو آگ میں پکنے سے اس حالت کو پہنچتی ہے۔ اسی کو دوسری جگہ کَالْفَخَّارِ "فرمایا اور "حَمَاً مَّسْنُوْنٍ" سڑا ہوا گارا جس سے بو آتی ہو، خیال یہ ہوتا ہے کہ اول سنے ہوئے گارے سے آدم کا پتلا تیار کیا۔ پھر جب خشک ہو کر اور پک کر کھن کھن بجنے لگا تب مختلف تطورات کے بعد اس درجہ پر پہنچا کہ انسانی روح پھونکی جائے۔ روح المعانی میں بعض علماء کا قول نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ **کانه سبحانه افرغ الحماء فصور من ذلك تمثال انسان اجوف فيبس حتى اذا نقرصوت ثم غير طورا بعد طور حتى نفخ فيه من روحه فتبارك الله احسن الخالقين۔** حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔ مٹی پانی میں تر کی اور خمیر اٹھایا کہ کھن کھن بولنے لگی وہ ہی بدن ہوا انسان کا اس کی خاصیتیں سختی اور بوجھ اس میں رہ گئیں۔ اسی طرح گرم ہوا کہ خاصیت (حدت وخفت) جنات کی پیدائش میں رہی۔ راغب اصفہانی نے ایک طویل مضمون کے ضمن میں متنبہ کیا ہے کہ حماً مسنون اور طین لازب وغیرہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ مٹی اور پانی کو ملا کر ہوا سے خشک کیا اور فخار کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ کسی درجہ میں آگ سے پکایا گیا۔ یہی ناری جزء آدمی کی شیطنت کا منشاء ہے اسی مناسبت سے ایک جگہ فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ و خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ۔ (سورہ رحمٰن: 14)

III- مولانا روم رحمہ اللہ نے اپنے اشعار میں جس ارتقا کا تصور دیا ہے وہ ڈارون کا ارتقاء نہیں ہے اور ہو بھی کیوں کر جب کہ یہ نصوص کے بھی خلاف ہے اور اس پر کوئی ٹھوس دلیل بھی نہیں بلکہ مولانا کی مراد وہ ہے جو بحر العلوم رحمہ اللہ نے مثنوی کی شرح میں لکھی ہے یعنی قولہ' آمدہ اول باقلیم جماد۔

قال اللّٰه تعالیٰ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔(سورہ مومنون: 12)

تحقیق پیدا کیا ہم نے انسان کو گارے کے خلاصے سے پھر ہم نے اس کو

مضبوط مکان میں نطفہ بنایا۔

ہر آئینہ پیدا کردم انسان را از سلالت و خلاصہ ازطین یعنی اجزائے زمین مخلوط بآب یعنی پیدا کردم آدم را از خلاصہ طین پستر گردانیدم نطفہ انسان را نطفہ یعنی درقرار مکین یعنی نسل آدم ازمنی و سلالت طین ظاہر ست کہ جماد ست ومنی رانیز جماد اعتبار کردند کہ در ظاہر اورا نمونیست مگر بہ تبعیت بدن۔ ثم خلقنا النطفة علقة فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً پستر گردانیدم نطفہ را علقہ خون بستہ پس پیدا کردیم علقہ رامضغہ در مدت استحالت منی سوئ علقہ و علقہ سوئے مضغہ او را موانست ظاہر النبات سوائے نموام و اینست معنی قول وی قدس سرہ از جمادی درنباتی اوفتاد۔

قولہ ''سالہا اندر نباتی عمر کرد آہ مراد ازسالہا مدت کثیرہ است و این چنیں اطلاق کثیر ست، فقہا گویند مدت علقہ و مضغہ دو ماہ و پنج روزست فخلقنا المضغة عظا ما

بے شک میں نے پیدا کیا انسان کو طین یعنی زمین کے پانی ملے اجزاء کے خلاصے سے، یعنی میں نے پیدا کیا آدم کو گارے کے خلاصے سے پھر کردیا ہم نے انسان کو نطفہ یعنی قرار مکین میں۔ یعنی نسل آدم منی سے ہے اور ظاہر ہے کہ خلاصہ طین جماد ہے اور منی کو بھی جمادات میں شمار کرتے ہیں کیونکہ ظاہر میں اس میں نمو نہیں ہے مگر بدن کے تابع ہو کر۔ پھر بنادیا ہم نے نطفہ کو علقہ جما ہوا خون پھر بنایا ہم نے جمے ہوئے خون کو مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) منی کے علقہ اور علقہ کے مضغہ بننے کی مدت میں اس کو نباتات کے ساتھ ظاہری موانست حاصل ہے اور یہی معنی ہے مولانا قدس سرہ کے قول ''از جمادی درنباتی اوفتاد'' کا۔

سالہا سے مراد مدت کثیرہ ہے اور اس طرح کا استعمال کثیر ہے۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ علقہ اور مضغہ کی مدت دو مہینے اور پانچ دن ہے پھر ہم نے بنا دیا لوتھڑے کو ہڈیاں پھر ہم نے ہڈیوں

فکسونا العظام لحما۔ پس پیدا کردیم مضغہ را استخوانہا پس پوشانیدم استخوانہا را گوشت و چوں عظام شد و لحم براں روئید حیوان شد لہذا جنین دریں مدت حرکت کند غیر حرکت طبعی و بایں ست اشارات در قول وی ''وزنباتی سوی حیوانی اوفتاد۔''

ثم انشاناه خلقا آخر فتبارك الله احسن الخالقين۔

پستر پیدا کردیم آنرا پیدائش آخر یعنی آنرا انسان گردانیدم و نفخ روح کردیم۔ پس صاحب برکت ست اللہ درحالیکہ احسن خالقاں اوست و باینست اشارت در قول وی قدس سرہ۔ ''باز از حیوان سوئ انسانیش'' الخ (دفتر چہارم)

پر گوشت چڑھا دیا اور جب ہڈیاں بن گئیں اور ان پر گوشت آ گیا تو حیوان بن گیا اسی لئے جنین انہی دنوں میں حرکت طبعی کے علاوہ بھی حرکت کرتا ہے اور اسی طرف اشارہ ہے ان کے قول وزنباتی سوئی حیوانی اوفتاد میں۔

پھر ہم نے اس کو ایک اور خلقت عطا کی یعنی اس کو ہم نے انسان بنا دیا اور اس میں روح پھونکی۔ پس برکت والا ہے اللہ اس حال میں کہ وہی احسن الخالقین ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہے ان کے قول ''باز از حیوان سوئ انسانیش'' میں۔

باب: 6

ڈاکٹر اسرار صاحب کا تصور دین و مذہب

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے اپنے بندوں پر اپنی اطاعت کی جو باتیں مقرر فرمائی ہیں تا کہ ان کے ذریعے سے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رحمت حاصل کریں ان سب باتوں کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں اور اس دین کا نام اسلام ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے: وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ (آل عمران:85)اور جو کوئی چاہے اسلام کے علاوہ دین کو تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا۔

دین کی باتیں دو طرح کی ہیں۔

1- کچھ وہ ہیں جو اصولی ہیں اور کبھی منسوخ نہیں ہوتیں جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت اور دیگر ایمانیات مثلاً انبیاء علیہم السلام پر، فرشتوں پر، کتب سماویہ پر، قیامت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان رکھنا اور یہ ایمان رکھنا کہ احکام صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں اور ان کے دیئے ہوئے احکام کو بجا لانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ان ہی باتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اخلاق فاضلہ کو حاصل کیا جائے۔ یہ باتیں تمام ادیان سماویہ میں مشترک ہیں اور قرآن میں فقط ان باتوں کو بھی مجازا دین کہا گیا ہے قرآن پاک میں ہے۔

شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا وَّالَّذِيۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ وَمَا وَصَّيۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰٓى اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ (سورہ شوری)

راہ ڈال دی تمہارے لئے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں۔

2- اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق عملی احکام سے ہے ان میں حسب مصلحت زمانہ تبدیلی ہوتی رہی ہے اور مختلف رسولوں کے ادوار میں ان میں سے بعض منسوخ ہوتی رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو احکام دیئے گئے ان میں سے بعض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں تبدیل کر دیئے گئے قرآن پاک میں ہے۔

وَلِاُحِلَّ لَكُمۡ بَعۡضَ الَّذِىۡ حُرِّمَ عَلَيۡكُمۡ (سورہ آل عمران: 50)

''اور تا کہ حلال کر دوں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو حرام کی گئی تھیں تم پر''۔

ان باتوں کو شریعت کہتے ہیں جس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ طریقہ:۔

چونکہ ہر نبوی دور کی شریعت دوسری سے مختلف رہی ہے اس لئے فرمایا: لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّ مِنۡهَاجًا (مائدہ: 48)

''تم میں سے ہر ایک کے لئے بنائی ہم نے شریعت اور راہ''۔

پھر آخر میں رسول اللہ ﷺ کو آخری شریعت دی گئی۔ فرمایا:

ثُمَّ جَعَلۡنٰكَ عَلٰى شَرِيۡعَةٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡهَا (جاثیہ: 18)

''پھر ہم نے آپ کو کیا دین کے ایک طریقہ پر''

اور چونکہ آپ کے بعد کوئی اور نئی نبوت نہیں ہے اس لئے آپ ﷺ کی شریعت غیر متبدل ہے۔

ایک اور اصطلاح ملت کی ہے۔ یہ دین کے ہم معنی ہے البتہ دونوں میں اتنا فرق ہے کہ دین کی اضافت و نسبت خدا رسول اور امت ان سب کی طرف ہوسکتی ہے۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کا دین، رسول خدا کا دین اور امت کے ایک فرد مثلاً زید کا دین جب کہ ملت کی اضافت و نسبت صرف رسول کی طرف ہوسکتی ہے خدا کی طرف اور امت کی طرف نہیں ہوسکتی۔ قرآن پاک میں فرمایا: مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفاً۔

دین کی باتوں کی تفصیل

دین کی باتیں پانچ قسم کی ہیں۔

1-عقائد 2-عبادات 3-معاملات 4-سزائیں

5-آداب

ان میں سے آداب کو چھوڑ کر باقی ہر ایک کی پھر موٹی موٹی پانچ قسمیں ہیں:

عقائد

(1) اللہ تعالیٰ پر ایمان (2) فرشتوں پر ایمان

(3) کتب الٰہیہ پر ایمان (4) رسولوں پر ایمان

(5) یوم آخرت پر ایمان

عبادات

(1) نماز (2) زکوٰۃ (3) روزہ (4) حج (5) جہاد

معاملات

(1) مالی معاملات (2) عائلی معاملات مثلاً نکاح طلاق وغیرہ

(3) باہمی جھگڑے اور امور عدالت (4) امانت کے معاملات

(5) ترکہ اور میراث

سزائیں

(جن کا خوف آدمی کو ارتکاب جرم سے روکے)

(1) کسی کو ناحق قتل کرنے پر (2) کسی کا مال ناحق لینے پر

(3) کسی کے ساتھ بدکاری پر (4) کسی پر بدکاری کا ناحق الزام لگانے پر

(5) کسی مسلمان کے اسلام ترک کرنے پر

آداب

(1) اخلاق (2) اچھے طور طریقے اور عمدہ باتیں

(3) حکومتی امور (4) معاشرتی امور

مذکورہ بالا تفصیل کے برخلاف ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں:

'' دین اپنی فطرت کے اعتبار سے غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دین درحقیقت دین ہے ہی نہیں جو غالب نہ ہو۔ چنانچہ انگریز کے دور غلامی میں جس دین کی اصل حکمرانی تھی وہ دین انگریز تھا۔ تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے مطاع مطلق برطانوی پارلیمان تھی''۔

(ص 92 مطالبات دین)

''معلوم ہوا کہ ہر نظام غلبہ چاہتا ہے اور اگر اسلام محض مذہب نہیں بلکہ دین ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے۔"ان الدین عند اللّٰہ الاسلام" تو اس کو غلبہ درکار ہے۔ یہ منزل انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہوگئی تھی......

میں بڑے عزم کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو صرف مذہب رہ جاتا ہے''۔ (ص 186 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

ان ملفوظات میں ڈاکٹر صاحب نے دو باتیں کہیں ہیں:

(1) دین و مذہب کے درمیان فرق (2) اسلام جب غالب نہ ہو تو وہ مذہب ہوتا ہے دین نہیں۔ ہم ان دونوں باتوں پر بالترتیب اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔

کیا دین و مذہب کے درمیان فرق ہے؟

اس بارے میں ڈاکٹر اسرار صاحب مزید لکھتے ہیں،

'' جدید ذہن دین کو زندگی کا ایک نجی PRIVATE معاملہ قرار دیتا ہے اور دین کو لفظ مذہب کا مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں مذہب کا یہی تصور راسخ ہوگیا ہے یہ تصور درست نہیں ہے۔ چونکہ اسلام مذہب ہرگز نہیں ہے بلکہ دراصل دین ہے ان الدین عند اللہ الاسلام۔ مذہب کے لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ چند مابعد الطبیعیات عقائد اور ان عقائد کے تحت چند رسوم عبودیت کی انجام دہی اور چند رسوم معاشرت کی پابندی کر لی جائے تو مذہب کا تقاضا پورا ہوگیا اور ان رسوم کا تعلق انسان کی ذاتی، شخصی اور نجی زندگی ہی سے

ہے۔ اس معنی میں اسلام مذہب ہے ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ پورے کے پورے قرآن مجید اور ذخیرہ احادیث نبوی میں ہمارے دین کی تعبیر کے لئے کسی جگہ بھی لفظ ''مذہب'' استعمال نہیں ہوا بلکہ اصل اصطلاح ''دین'' استعمال ہوئی ہے''۔
(ص 92 رسالہ مطالبات دین)

''دین اللہ یہ ہے کہ صرف اللہ کو مطاع و حاکم مطلق اور حقیقی مقنن تسلیم کر کے اس کی جزا کی امید اور اسی کی سزا سے خوف کرتے ہوئے صرف اسی کے قانون، اسی کے ضابطے اور اسی کی دی ہوئی شریعت کے مطابق اپنے انفرادی و اجتماعی معاملات کو انجام دیا جائے۔ بالفاظ دیگر صرف اور صرف اسی کی کامل اطاعت میں پوری زندگی کو جکڑ دیا جائے''۔ (ص 92 رسالہ مطالبات دین)

گویا ڈاکٹر صاحب نے دین و مذہب کے درمیان جو فرق کیا ہے وہ یہ ہے کہ دین تو کسی ذات کو مطاع مطلق مان کر اس کی کامل اطاعت کرنے کا نام ہے اور مذہب چند مابعد الطبیعاتی عقائد اور چند رسوم عبودیت و معاشرت کا نام ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے خاصے دلکش پیرائے میں بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایک تو یہ بات اصولاً غلط ہے دوسرے اس میں کچھ مفاسد بھی مضمر ہیں جن کی ہم نشاندہی کریں گے (انشاءاللہ تعالیٰ) کتب لغت میں ان الفاظ کے معنی یوں بیان ہوئے ہیں۔

المنجد میں: الدین ج ادیان: الطاعة۔ رسم لجمیع مایعبد به الله۔ الملة و المذهب۔

المذہب ج مذاہب: المعتقد۔ الطریقه۔ الاصل

مصباح اللغات میں: دین: **مذہب وملت**۔

فرہنگ آصفیہ: دین: کیش، مذہب، ملت، پنتھ،

مذہب: دین، آئین عقیدہ، ملت، کیش۔

المورد میں: دین، RELIGION

Oxford Pocket Dictionary میں ہے۔

Religion: System of faith and worship Human recognition

of a Personal God entitled to obedience.

معلوم ہوا کہ دین۔ ملت، مذہب اور RELIGION یہ سب الفاظ ایک معنی کی ادائیگی کے لئے بھی وضع ہوئے ہیں اور استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ عربی زبان میں دین کا لفظ زیادہ مستعمل ہے جب کہ اردو زبان میں دین کے معنی میں مذہب کا لفظ بھی کثیر الاستعمال ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب کا ہر حال میں دین و مذہب کے درمیان فرق سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ آپس میں مترادف بھی ہیں۔

باقی ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ ''مذہب کے لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ چند مابعد الطبیعیات عقائد الخ'' تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مذہب کا لفظ مذکورہ محدود معنی کے لئے وضع ہوا ہے (فرہنگ آصفیہ دیکھیں تو مذہب کا یہ مطلب کہیں لکھا ہوا نہیں ملے گا کہ وہ کچھ عقائد اور کچھ رسوم عبودیت و معاشرت کا نام ہے) بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں جب فکری و صنعتی انقلاب وضع ہوا اور کلیسا کی جانب سے بہت سی باتوں پر کفر کے فتوے لگائے گئے اور سائنسی تحقیقات کرنے والوں کو اپنی تحقیقات اور دریافتوں پر عقوبتیں برداشت کرنی پڑیں تو کلیسا کے خلاف ردعمل پیدا ہوا، اور لوگوں نے بے لگام کلیسا کو محض چند عقائد اور چند مذہبی و معاشرتی رسومات تک محدود کر دیا۔ کلیسا کے خلاف یہ ردعمل قابل فہم بھی ہے کیونکہ کلیسا نے واقعی اپنی حد سے تجاوز کیا تھا۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر بات اتنی ہے کہ دین، مذہب، ملت اور RELIGION کے مفہوم کو یورپ والوں نے عملاً چند عقائد و رسومات تک محدود کر دیا اور باقی معاملات میں خود مختار ہو گئے RELIGION کو انہوں نے ایک شخص کا نجی اور پرائیویٹ معاملہ سمجھ لیا چونکہ اردو میں دین وملت کے لئے مذہب کا لفظ بھی کثیر الاستعمال ہے، اس لئے RELIGION کا عام طور پر ترجمہ مذہب کیا جاتا ہے۔ اس لئے مودودی صاحب کی اتباع میں ڈاکٹر صاحب نے یہ خیال کیا کہ RELIGION کے لفظ میں عملاً جو محدودیت ہے، وہ لفظ مذہب میں بھی ہو گی اور یہ خیال نہ رہا کہ مذہب کا لفظ دین کا مترادف بھی ہے۔ اور چونکہ مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو مغرب کی تقلید میں دین و مذہب کا ایسا

ہی محدود تصور رکھتا ہے لہٰذا اس خیال کی مزید تائید بھی ہوگئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا ایسا خیال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ:

(1) عربی اور اردو دونوں زبانوں میں لفظ مذہب دین کا مترادف بھی ہے جیسا کہ لغت کے حوالوں سے معلوم ہوا۔

(2) لفظ RELIGION کے مفہوم میں عملاً محدودیت واقع ہوئے تقریباً دوسو سال ہو گئے ہیں جب کہ اس وقت مسلمانوں کی حکومتیں ابھی قائم تھیں۔ اسلام کو اس وقت بھی RELIGION کہا جاتا تھا۔

ممکن ہے کوئی یہ خیال کرے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسا محض ایک طبقہ کے اعتبار سے کہا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ مذہب کو محدود تصور کرنے والوں کے اعتبار سے یہ بات کہی گئی ہوتی تو قابل برداشت تھی لیکن ڈاکٹر صاحب تو دین و مذہب کو ایک کہنا علی العموم غلطی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو مذہب ہوتا ہے حالانکہ محدود تصور رکھنے والے دین اور مذہب کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک لفظ کے وضع کے اعتبار سے دین کا مفہوم بڑا وسیع اور مذہب کا مفہوم بڑا محدود ہے۔

کیا اسلام جب غالب نہ ہو تو وہ مذہب ہوتا ہے دین نہیں؟

ڈاکٹر اسرار صاحب کا یہ بات کہنا بوجوہ ذیل غلط ہے۔ انہی وجوہ سے ڈاکٹر صاحب کی بیان کردہ تفریق میں مضمر مفاسد بھی ظاہر ہو جائیں گے۔

(1) لغت والے ایسی کوئی تفریق نہیں کرتے۔

(2) اسلام کے ابتدائی دور میں یعنی مکی دور میں جب کہ مسلمانوں کو اور اسلام کو غلبہ حاصل نہ تھا۔ اس' وقت بھی قرآن پاک نے اسلام کو دین کہا۔ دیکھئے سورہ کافرون میں ہے''لکم دینکم ولی دین:
اسی طرح سورہ یونس میں ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِىْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰىكُمْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا۔(سورہ یونس: 104)

کہہ دے کہ اے لوگو! اگر تم شک میں ہو میرے دین سے تو میں عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو کھینچ لیتا ہے تم کو اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں ایمان والوں میں اور یہ کہ سیدھا کر منہ اپنا دین پر حنیف ہو کر۔

سورہ زمر میں ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًالَّهُ الدِّيْنَ۔

ہم نے اتاری ہے تیری طرف کتاب ٹھیک ٹھیک سو بندگی کر اللہ کی خالص کر کے اس کے واسطے دین۔

''قرآن ہی سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر میں بادشاہت کا نظام قائم تھا اور آنحضرت علیہ الصلوۃ والسلام اس نظام میں بہت بڑے عہدے پر فائز تھے''۔ (ایضاً)

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک ایسے نظام میں جس میں بادشاہ کو مطاع، مقنن اور حاکم مطلق کا درجہ حاصل تھا کیوں خود ایک منصب کو اختیار کیا، حالانکہ مطاع، مقنن اور حاکم مطلق تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے بلکہ جیل میں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے دو اور قیدیوں سے یوں خطاب کیا۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔(سورہ یوسف)

حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے اس نے فرما دیا کہ نہ پوجو مگر اسی کو یہی ہے راستہ سیدھا۔

ایک پورے نظام سے جو بادشاہ کی حاکمیت (مطلقہ) اور اطاعت مطلقہ کی بنیاد پر قائم ہو کوئی کتنا ہی بڑا عہدہ منصب کیوں نہ ہو آزاد نہیں ہو سکتا ورنہ تو ایک نظام نہیں بلکہ دو نظام بیک وقت رائج ہوں گے، ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے ایسی بات کہہ

کر حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بہت بڑی جسارت کی ہے۔

3- ڈاکٹر اسرار صاحب کی یہ عبارت دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔ ''...... وہ دین درحقیقت دین ہے ہی نہیں جو غالب نہ ہو چنانچہ انگریز کے دورِ غلامی میں جس دین کی اصل حکمرانی تھی وہ دین انگریز کا تھا۔ تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے مطاع مطلق برطانوی پارلیمان تھی''۔ (ص 92 مطالبات دین)

اس عبارت سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں، کہ چونکہ انگریز کے دورِ غلامی میں اسلام غالب نہیں تھا لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کا وہ دین نہ رہا تھا بلکہ ان کا دین، دین انگریز تھا اور ان کا مطاع مطلق برطانوی پارلیمان تھی اور ایسا نتیجہ کیوں نہ نکلے جب کہ ڈاکٹر اسرار صاحب فرماتے ہیں۔

''دین اصل میں اس سے بحث کرتا ہے کہ مطاع کون ہے، حاکم کون ہے، حاکمیت کس کی ہے، قانون کس کا چلے گا، مرضی کس کی چلے گی اور وہ حاکمیت کس طرح روبعمل ہوگی۔ کس کے واسطے سے ہوگی، کون اس کا نمائندہ ہوگا''۔ (ص 96 مطالبات دین)

جب یہ تمام امور عملاً حکمران انگریزوں کے نظام میں موجود تھے اور وہ نظام ہندوستان میں عملاً رائج تھا تو معلوم ہوا کہ ہندوستانیوں کا بشمول مسلمانوں کے دین، دین انگریز تھا اور دین اسلام محض چند عقائد اور چند رسوم کا مجموعہ بن کر مذہب میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ان کا مطاع مطلق برطانوی پارلیمان تھی اور اس کی مرضی چلتی تھی۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے الفاظ کے الٹ پھیر میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی تحریک وجدوجہد آزادی کی پوری تاریخ کو طاق نسیان پر رکھ دیا ہے بلکہ مسلمانوں پر اپنے دین کو ترک کرنے اور دین انگریز کو اختیار کرنے اور برطانوی پارلیمان کو مطاع مطلق ماننے کی العیاذ باللہ، تہمت بھی لگائی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی بحیثیت مجموعی جدوجہد آزادی شروع سے آخر تک رہی۔ تحریک شہیدین (یعنی سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ)، تحریک مجاہدین، 1857ء کی جنگ آزادی، تحریک خلافت، تحریک ریشمی رومال،

تحریک پاکستان۔ یہ سب تحریکیں اور کاوشیں آخر کس کو مطاع مطلق مان کر تھیں۔ اگر برطانوی پارلیمان ہی ان کی مطاع مطلق تھی تو کیا یہ سب قربانیاں اسی کی اطاعت میں تھیں؟ ڈاکٹر صاحب کو اختیار ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے اسباب کو معاشرتی و معاشی کہیں لیکن وہ اس سے انکار نہیں کر سکیں گے کہ مسلمان عوام سے ووٹ اسلام، اسلامی آئین اور اسلامی نظام کے نام پر لئے گئے تھے۔ جب مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی آئین جاگزیں تھا اور وہ اس کے لئے قربانیاں دے رہے تھے تو یہ تو نہیں ہوسکتا کہ انگریز کا آئین بھی ان کے دلوں میں پیوست تھا کیونکہ ان دونوں کے درمیان منافات ہے۔ تو جب تک کسی کو مطاع مطلق تسلیم نہ کیا جائے اس کا دین قبول نہ ہوگا۔ لہٰذا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی دین انگریز کو کبھی قبول نہیں کیا اور ہم سمجھتے ہیں کہ انگریزی دین اور انگریزی قانون کے درمیان فرق ڈاکٹر صاحب پر مخفی نہیں ہوگا اور مسلمانوں کی مجموعی و انفرادی کوششیں بھی اس لئے تھیں کہ انگریزی قانون کی جگہ اسلامی قانون آئے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے پاس منکر نکیر آتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں۔ ما دینك (تیرا دین کیا ہے؟) مومن و مسلم ہو تو جواب دیتا ہے۔ دینی الاسلام (میرا دین اسلام ہے) ڈاکٹر اسرار صاحب کے قول کے مطابق جب اسلام مغلوب ہو چکا تو مسلمانوں کا دین اسلام تو نہ رہا۔ پھر نہ جانے انگریزوں کے آنے کے وقت سے اب تک مرنے والے مسلمان ان کو کیا جواب دیتے ہوں گے۔

تصور دین اور ڈاکٹر اسرار صاحب کا ذہنی انتشار

تصور دین کے بارے میں ڈاکٹر اسرار صاحب ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ دین کا مطلب کبھی وہ کچھ بتاتے ہیں اور کبھی کچھ بتاتے ہیں مثلاً

1- اپنی کتاب ''مطالبات دین'' کے ص 92 پر لکھتے ہیں۔

''دین اللہ یہ ہے کہ صرف اللہ کو مطاع و حاکم مطلق اور حقیقی مقنن تسلیم کر کے اس کی جزا کی امید اور اسی کی سزا سے خوف کرتے ہوئے صرف اسی کے

قانون، اسی کے ضابطے اور اسی کی دی ہوئی شریعت کے مطابق اپنے انفرادی و اجتماعی معاملات کو انجام دیا جائے، بالفاظ دیگر صرف اور صرف اس کی کامل اطاعت میں پوری زندگی کو جکڑ دیا جائے''۔

یہاں دین کا مطلب خاص طرز اور ضابطہ کے مطابق عمل کرنا، معاملات سرانجام دینا اور زندگی بسر کرنا بتایا۔

2- ''مطالبات دین'' کے ص 91 پر لکھتے ہیں۔

''دین کے معنی ہیں ایک پورا نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع، مقنن اور حاکم مطلق مان کر اس کی جزا کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ کردہ قانون اور ضابطے کے مطابق اس ہستی (یا ادارے) کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے''۔

''لہٰذا دیکھ لیجئے یہاں بادشاہی کے اس پورے نظام کو جو بادشاہ کی حاکمیت کی بنیاد پر مصر میں رائج تھا دین الملک سے تعبیر کیا گیا''۔

یہاں ڈاکٹر اسرار صاحب نے دین کا مطلب رائج ضابطہ حیات اور نظام زندگی بتایا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ضابطہ حیات اور نظام زندگی اور چیز ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنا اور اس پر عمل کرنا اور چیز ہے۔

3- ''مطالبات دین'' ص 96 پر لکھتے ہیں۔

''دین اصل میں اس سے بحث کرتا ہے کہ مطاع کون ہے، حاکم کون ہے، حاکمیت کس کی ہے، قانون کس کا چلے گا، مرضی کس کی چلے گی اور وہ حاکمیت کس طرح روبعمل ہوگی، کس کے واسطے ہوگی، کون اس کا نمائندہ ہوگا''۔

یہاں ڈاکٹر اسرار صاحب نے دین کو آئین (CONSTITUTION) کے معنی میں بتایا ہے۔ آئین تو ایک فکری چیز ہے جس پر ایک نظام قائم کیا جاتا ہے اور لوگ اس نظام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چیز دوسرے سے جدا حقیقت رکھتی ہے۔

4- ''مطالبات دین'' ص 95 پر لکھتے ہیں۔

''دین حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد ﷺ تک سب انبیاء و رسول کا ایک ہی رہا ہے۔ اس میں کسی دور میں بھی قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ سب کا دین ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کامل توحید کے ساتھ، ملائکہ، نزول کتب اور ارسال انبیاء پر ایمان اور بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب، جزا و سزا اور جنت و دوزخ یعنی آخرت میں پیش آنے والے تمام احوال پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ حاکم مطلق صرف اللہ ہے وہی مقنن حقیقی ہے''۔

ڈاکٹر صاحب نے یہاں دین کو آئین کے معنی تو دیئے ہیں لیکن اس کے ساتھ بہت سی ایسی باتیں بھی شامل کر دی ہیں جن کا اصل موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ وہ خود ہی ص 96 پر وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''دین اصل میں اس سے بحث کرتا ہے کہ مطاع کون ہے، حاکم کون ہے، حاکمیت کس کی ہے، قانون کس کا چلے گا......الخ''۔

اب سابقہ انبیاء و رسل پر ایمان لانا، سابقہ کتابوں پر ایمان لانا، حضرت جبرئیل علیہ السلام کے علاوہ دیگر فرشتوں پر ایمان لانا، تقدیر پر ایمان لانا ان باتوں کا ڈاکٹر اسرار صاحب کے بتائے ہوئے اصل موضوع سے تو کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کی اس غلطی کا منبع

ڈاکٹر اسرار صاحب نے دین کا جو معنی بتایا ہے وہ انہوں نے مودودی صاحب سے لیا ہے جو وہ اپنی کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات میں لکھتے ہیں:

''کلام عرب میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(1) غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرماں روائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اس پر اپنی قوت قاہرہ استعمال کرنا، اس کو اپنا غلام اور تابع امر بنانا۔

(2) اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لئے مسخر ہو جانا، کسی کے تحت امر ہونا، کسی کے غلبہ وقہر سے دب کر اس کے مقابلہ میں ذلت قبول کر لینا۔

(3) شریعت و قانون، طریقہ کیش وملت، رسم و عادت۔

(4) جزاوعمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ،

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ دین کی بنیاد میں چار تصورات ہیں یا بالفاظ دیگر یہ لفظ عربی ذہن میں چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے:

(1) غلبہ وتسلط کسی ذی اقتدار کی طرف سے۔

(2) اطاعت، تعبد اور بندگی صاحب اقتدار کے آگے جھک جانے والی کی طرف سے۔

(3) قاعدہ وضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے۔

(4) محاسبہ اور فیصلہ اور جزا وسزا۔

انہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لئے اور کبھی دوسرے کے لئے اہل عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ مگر چونکہ ان چاروں امور کے متعلق عرب کے تصورات پوری طرح صاف نہ تھے اور کچھ بہت زیادہ بلند بھی نہ تھے۔ اس لئے اس لفظ کے استعمال میں ابہام پایا جاتا تھا۔ اور یہ کسی باقاعدہ نظام فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا، قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لئے مناسب پا کر بالکل واضح و متعین مفہومات کے لئے استعمال کیا اور اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنا لیا۔ قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے جس کی ترکیب چار اجزاء سے ہوتی ہے۔

(1) حاکمیت و اقتدار اعلیٰ۔

(2) حاکمیت کے مقابلے میں تسلیم و اطاعت۔

(3) وہ نظام فکر وعمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر بنے۔

(4) مکافات جو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری و اطاعت کے صلے میں یا سرکشی و بغاوت کی پاداش میں دی جائے۔ قرآن کبھی لفظ دین کا اطلاق معنی اول و دوم پر کرتا ہے، کبھی معنی سوم پر، کبھی معنی چہارم پر اور کہیں الدین بول کر یہ پورا نظام اپنے چاروں اجزا سمیت مراد لیتا ہے۔

اسی کتاب کے ص 153 پر لکھتے ہیں۔

''یہاں تک تو قرآن اس لفظ کو قریب قریب انہی مفہومات میں استعمال کرتا ہے۔ جس میں یہ اہل عرب کی بول چال میں مستعمل تھا۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لفظ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے ایک ایسا نظام زندگی مراد لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کر لے۔ اس کے حدود ......اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے۔ اس کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو، اور اس کی نافرمانی پر ذلت وخواری اور سزا سے ڈرے۔ غالبًا دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے نظام پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ STATE کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن ابھی اس کو دین کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لئے مزید وسعت درکار ہے۔

حسب ذیل آیات میں دین اسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ۔ (سورہ توبہ: 29)

اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں (یعنی اس کو واحد مقتدر اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے، نہ یوم آخرت (یعنی یوم الحساب اور یوم الجزاء) کو مانتے ہیں نہ ان چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے، ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ۔ (المومن، 26)

فرعون نے کہا چھوڑو مجھے میں اس موسیٰ کو قتل ہی کئے دیتا ہوں اور اب پکارے وہ اپنے رب کو مجھے خوف ہے کہ کہیں یہ تمہارا دین نہ بدل دے یا ملک

میں فساد نہ کھڑا کر دے۔

قرآن میں قصہ فرعون وموسیٰ کی جتنی تفصیلات آئی ہیں۔ ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین مجرد مذہب کے معنی میں نہیں آیا ہے۔ بلکہ ریاست اور نظام تمدن کے معنی میں آیا ہے۔فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا، جو نظام زندگی اس وقت فراعنہ کی حاکمیت اور رائج الوقت قوانین ورسوم کی بنیادوں پر چل رہا ہے وہ جڑ سے اکھڑ جائے گا اور اس کی جگہ یا تو دوسرا نظام بالکل ہی دوسری بنیادوں پر قائم ہوگا یا نہیں تو سرے سے کوئی نظام قائم ہی نہ ہو سکے گا بلکہ تمام ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ۔ (آل عمران۔ 19)

اللہ کے نزدیک دین تو دراصل اسلام ہے۔

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ (آل عمران: 85)

اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

ھُوَالَّذِیۡ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ۔ (توبہ: 33)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو صحیح رہنمائی اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ وہ اس کو پورے جنس دین پر غالب کر دے اگر چہ شرک کرنیوالوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

وَقَاتِلُوۡھُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّ یَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ (انفال: 39)

اور تم ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے۔

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا۔ (سورہ نصر)

جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح نصیب ہو چکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اب اپنے رب کی حمد وثنا اور اس سے درگزر کی درخواست کرو۔ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔

ان سب آیات میں دین سے پورا نظام زندگی اپنے تمام اقتصادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے''۔ (ص 152 تا ص 155 قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)۔

جواب

مودودی صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ مذکورہ پانچواں معنی ان کے بقول قرآن پاک کی اپنی اصطلاح ہے۔جس کا تصور عربوں میں نہیں تھا۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا لغوی یا شرعی اعتبار سے یہ معنی صحیح ہے۔

جہاں تک لغت کا تعلق ہے تو چونکہ یہ حقیقی معنی نہیں ہے لہٰذا مجاز ہوا، اور یہ لغت کا قاعدہ ہے کہ مجاز کی طرف صرف اس وقت رخ کریں گے جب حقیقت مراد لینا ممکن نہ ہو حالانکہ آیت نمبر 1 تا 6 میں دین کا مطلب طریقہ لینا ممکن ہے اور آیت نمبر 7 میں اطاعت کا معنی کرنا بھی ممکن ہے۔ پس لغوی وعقلی قواعد کی بناء پر حقیقت کو چھوڑ کر مجازی معنی اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔

شرعاً دیکھا جائے تو دین کا ایسا معنی جیسا کہ مودودی صاحب نے ذکر کیا ہے نہ تو وضاحت کے ساتھ قرآن پاک میں کہیں مذکور ہے نہ ذخیرہ احادیث میں اور نہ ہی کسی تفسیر میں۔

پس مودودی صاحب (اور ان کی اتباع میں ڈاکٹر اسرار صاحب) نے دین کے جو اصطلاحی معنی اختراع کئے ہیں وہ بے بنیاد اور بلا دلیل ہیں۔ اور پھر یہ غلطی اس بنا پر اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے کہ ان دونوں صاحبان میں تفسیر کرنے کی سرے سے اہلیت و صلاحیت بھی نہیں ہے۔

باب: 7

ڈاکٹر اسرار صاحب کا تصور اقامت دین

تصور دین کے بارے میں ڈاکٹر اسرار صاحب کے انتشار ذہنی اور دیگر اغلاط سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم ان کے دیئے ہوئے تصور اقامت دین کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی گمراہی سے خالی نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے اقامت دین کے لئے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ۔ **(سورہ شوری: 13)**

اے مسلمانو! تمہارے لئے ہم نے مقرر کیا از جنس دین وہی جس کی وصیت کی تھی نوح علیہ السلام کو اور جو وحی کیا گیا ہے اے نبی تیری جانب اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اور موسی علیہ السلام کو اور عیسیٰ علیہ السلام کو کہ دین کو قائم کرو۔

بعد میں لکھتے ہیں:

''اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ جو دین اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نازل کیا تھا اور خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پایا اس کے نزول کا مقصد تھا اس دین اللہ کا بالفعل قیام و نفاذ۔ چنانچہ آیت کے اگلے ٹکڑے میں فرمایا کہ ان اقیموا الدین (دین کو قائم کرو) یعنی دین بالفعل نافذ ہو۔ دین (اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ) کے مطابق تمام معاملات طے ہوں، تمام امور کا تصفیہ کیا جائے، کسی کام

کو حرام و حلال، جائز و ناجائز قرار دینے کا اللہ کو کامل مختار و مجاز تسلیم کیا جائے۔ اس سے سرمو انحراف نہ کیا جائے۔ جب تک امر واقعہ میں یہ صورت حال عملاً نافذ نہیں ہوتی اس وقت تک دین کے قیام کا مقصد پورا نہیں ہوتا جو انزال وحی، ارسال کتب اور بعثت انبیاء و رسل کا بنیادی و اساسی مقصد ہے۔ (مطالبات دین ص 94)

اور امر واقعہ میں یہ صورت حال عملا اس وقت نافذ سمجھی جائے گی جب کسی علاقہ میں اسلامی نظام پر مبنی اسلامی حکومت قائم ہو جائے جیسا کہ خود ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

''تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اس کے دین حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لئے تن من دھن سے کوشاں ہو، اس کے لئے قرآن حکیم کی چار اساسی اصطلاحات ہیں۔ تکبیر، رب، اقامت دین، اظہار دین الحق علی الدین کلہ اور حدیث نبویؐ میں ایک پانچویں اصطلاح وارد ہوئی ہے۔ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا اور......

تین عام فہم تعبیرات ہیں۔ قیام حکومت الٰہیہ، نفاذ نظام اسلامی اور اسلامی انقلاب''۔ (ص 109 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

جواب

ڈاکٹر اسرار صاحب نے جس آیت سے استدلال کیا ہے ان کے بقول اس میں پانچ اولوالعزم پیغمبروں کو اقامت دین کا حکم ہوا۔ بالفاظ دیگر ان کو حکومتی سطح پر اسلامی انقلاب برپا کرنے اور حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا حکم ہوا لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان کی جانب سے حکومت قائم کرنے کی کوئی بھی کوشش منقول نہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں سے صرف چند افراد مسلمان ہوئے ان کے اپنے گھر والوں میں سے بعض افراد کفر پر قائم رہے۔ وہ اپنی کوشش سے حکومت الٰہیہ قائم نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت سے کافر قوم کو غرق کر دیا پھر جو چند مسلمان تھے ان کی تعداد ہی اتنی قلیل تھی کہ کسی حکومت کی تشکیل کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی میدان تیہ میں وفات ہوئی۔ نہ کوئی شہر تھا نہ ملک تھا حکومت الٰہیہ کیا قائم ہوتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے چند لوگ تھے۔ یہود جان کے دشمن بن گئے تو آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ ایسے میں اسلامی حکومت و ریاست قائم کرنے کی کوشش کیسے متصور ہوسکتی ہے۔

مکہ مکرمہ میں ہجرت سے قبل نبی ﷺ اور صحابہ کی جانب سے اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوئی شعوری اور بلا واسطہ محنت مفقود ہے۔ مشرکین مکہ جب جان کے در پے ہو گئے تو مجبوراً ہجرت کرنا پڑی۔ مدینہ منورہ میں حکومت الٰہیہ قائم ہوئی تو وہ محض عطیہ خداوندی تھی۔

ہماری اس بات پر اکثر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ حکومت قائم کرنے کے لئے کوشش تو ابتداء ہی سے کرنی ہوگی۔ اس سے تو ہمیں انکار نہیں لیکن جب حکم تو یہ ہو کہ دین بالفعل نافذ ہو یعنی بالفعل حکومت الٰہیہ قائم کرو تو معاملہ اگر ابتدائی تبلیغ پر رک جائے اور حکومت بالفعل قائم نہ ہو تو اس کو حکم پورا کرنا نہیں کہتے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب بھی مجبور ہو کر یہی عذر بتاتے ہیں لہٰذا لکھتے ہیں:

"قرآن حکیم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت علیہ السلام (حضرت نوح علیہ السلام) پر ان کے گھر والے ہی ایمان لائے تھے۔ اس میں بھی ایک بیٹے نے دعوت حق قبول نہیں کی تھی وہ کفر پر ہی اڑا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ چند انگلیوں پر گنے جانے والے اور لوگ بھی ایمان لائے ہوں۔ بہر حال ساتھی نہ ملے، جمعیت فراہم نہیں ہوئی، اگلا قدم کیسے اٹھتا۔ اعوان و انصار نہ ہوں تو اگلی منزل کی طرف پیش رفت کیسے ہو۔ لیکن نوح علیہ السلام کی استقامت و مصابرت دیکھئے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت و تبلیغ میں لگا دیئے اور کھپا دیئے اور اپنے فرض منصبی کو ادا کر دیا"۔ (ص 197 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ عام عقل والا شخص بھی اس کو تسلیم نہیں کرے گا کہ حکم تو دیا گیا ہو ایک نظام برپا کرنے کا تاکہ عبادت اور شہادت حق علی الناس بکمالہ ادا ہوسکیں اور حضرت نوح علیہ السلام اس کو پورا بھی نہ کر پائیں پھر بھی وہ اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے والے کہلائیں۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو محض اجتماعی نظام کی برکتوں کے مشاہدہ سے ہی متاثر ہوتے ہیں ان کو یہ موقع بھی فراہم نہ ہوا، اور ڈاکٹر صاحب کے اپنے فلسفہ کے علی الرغم باوجود اس کے کہ عبادت بھی ناقص کی، شہادت حق بھی پورا نہیں کیا اور نظام اسلامی برپا کرنا تو بہت ہی دور رہا، لیکن پھر بھی اقیموا الدین پر پورا عمل ہو گیا اور فرض منصبی بکمالہ ادا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ایسی ناقص سمجھ سے محفوظ رکھیں۔

جب ڈاکٹر اسرار صاحب کے بتائے ہوئے معنی درست ثابت نہیں ہوئے تو اب ہم درست معنی نقل کرتے ہیں۔

امام رازیؒ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

یجب ان یکون المراد من هذا الدین شیئا مغایرا للتکالیف والا حکام و ذلك لا نها مختلفة متفاوتة قال الله تعالیٰ لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا فیجب ان یکون المراد منه الامور التی لا تختلف باختلاف الشرائع وهی الایمان بالله تعالیٰ و ملائکته و کتبه و رسله والیوم الاخر، والایمان یوجب الاعراض عن الدنیا والا قبال علی الاخرة السعی فی مکارم الاخلاق والاحتراز عن رزائل الاحوال۔ (ص 156، ج 27)

واجب ہے کہ اس دین سے مراد ایسی شئی ہو جو تکالیف و احکام کی غیر ہو، کیونکہ تکالیف و احکام مختلف اور متفاوت ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا" پس واجب ہے کہ اس سے مراد وہ امور ہوں جو شریعتوں کے اختلاف سے نہیں بدلتے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان۔ اور ایمان دنیا سے اعراض اور آخرت کی طرف توجہ اور مکارم اخلاق کے لئے کوشش اور رذیل حالات سے بچنے کا موجب ہے۔

روح المعانی میں ہے:

لم یبعث نبی الا امر باقامة الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة والا قرار باللّٰه تعالیٰ وطاعة سبحانه و ذلك اقامة الدین۔

کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا مگر یہ کہ اس کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے اور اللہ تعالیٰ کو ماننے اور اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا اور یہی اقامت دین ہے۔

نیز روح المعانی میں ہے۔

ای دین الاسلام الذی هو توحید الله تعالیٰ و طاعته والایمان بکتبه و رسله و بیوم الجزاء وسائر مایکون العبدبه مومنا والمراد باقامته تعدیل ارکانه و حفظه من ان یقع فیه زیغ و المواظبة علیه۔

یعنی دین اسلام ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی اطاعت ہے اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم جزا اور وہ تمام باتیں جن سے ایک بندہ مومن بنتا ہے ان پر ایمان لانا ہے۔ اور دین کی اقامت سے مراد اس کے ارکان کی اچھے طریقے سے پابندی ہے اور دین کی اس بات سے حفاظت کرنا ہے کہ اس میں کوئی کجی واقع ہو اور اسی پر ہمیشگی کرنا ہے۔

حضرت مجاہدؒ، امام رازی اور علامہ آلوسیؒ تو اس دور کے لوگ ہیں جب اسلامی حکومتیں نہ صرف قائم تھیں بلکہ ان کا بڑا رعب اور دبدبہ بھی تھا لیکن یہ لوگ دین کا وہ اصطلاحی معنی نہیں بتاتے جو مودودی صاحب اور ڈاکٹر اسرار صاحب بیان کرتے ہیں اور اقامت دین سے وہ مراد نہیں لیتے جو مودودی صاحب اور ڈاکٹر اسرار صاحب مراد لیتے ہیں۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر ڈاکٹر اسرار صاحب کہیں کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن پاک میں "هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ" کی آیت تین مرتبہ وارد ہوئی ہے۔ اس سے اس کے بنیادی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے اور اس آیت میں غلبہ دین ہی کی تو بات ہے اور اس آیت کا ترجمہ یہی تو ہے۔

''وہی ہے اللہ وہ ذات بابرکت جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت

اور دین حق دے کر کتاب بھی دی اور نظام زندگی یعنی شریعت بھی، احکام بھی دیئے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے ضابطے بھی دیئے۔ صحیح و غلط کے معیارات بھی قائم کئے تاکہ حضور ﷺ اس ہدایت اور دین حق کو ہر جنس دین پر غالب کر دیں'' (ص 88 مطالبات دین)

اپنی کتاب منتخب نصاب میں تحریر کرتے ہیں۔

''خود سورہ صف کا عمود اس کی آیت نمبر 9 سے معین ہوتا ہے یعنی اظہار دین الحق علی الدین کلہ یا اللہ کے دین حق کو کل کے کل دین یا نظام زندگی پر غالب و نافذ کرنا، جس سے بیک وقت دین کے فلسفہ وحکمت کے تین اہم اور بنیادی مضامین کی وضاحت کی ہے۔

اولاً اس سے الجہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل، مقصود یا غایت قصویٰ کا تعین ہوتا ہے۔

ثانیاً اس سے مطالبات دین کے ضمن میں بھی مرتبہ تکمیل کا تعین ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عبادت رب کا حق بھی اس وقت تک کاملۃً ادا نہیں ہوسکتا جب تک اللہ کا دین پورے نظام زندگی پر غالب نہ ہو، اس لئے کہ اس صورت میں اللہ کی اطاعت صرف انفرادی زندگی میں کی جا سکتی ہے۔ انسانی زندگی کے وہ گوشے اس سے خالی رہ جائیں گے جو اجتماعی نظام کے زیر تسلط ہوتے ہیں......الخ۔

ثالثاً اس سے نبی اکرم ﷺ کے مقصد بعثت کی امتیازی یا اتمامی و تکمیلی شان بھی واضح ہوتی ہے، مختصراً یہ کہ:

(1) آنحضور ﷺ دو چیزوں کے ساتھ مبعوث ہوئے، ایک الہدیٰ یعنی قرآن مجید اور دوسرے دین الحق یعنی اطاعت خداوندی کے اصل الاصول پر مبنی انسانی زندگی کا مکمل اور متوازن نظام عدل وقسط۔

(2) آپ کے مقصد بعثت میں جہاں انذار وتبشیر، دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفوس اور تصفیہ قلوب ایسے اساسی و بنیادی امور بھی لامحالہ شامل ہیں جو بعثت انبیاء

ورسل کی اصل غرض و غایت ہیں وہاں دین حق کی شہادت و اقامت کا اتمامی و تکمیلی مرحلہ بھی شامل ہے اور یہی آپ ﷺ کے مقصد بعثت کی امتیازی شان ہے''۔ (ص93, 94 منتخب نصاب)

اور یہی بتانے کے لئے کہ اظہار دین الحق علی الدین کلہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شاہ ولی اللہؒ کی کتاب ازالۃ الخفاء کا حوالہ اپنی کتاب جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی میں دیا ہے۔

جواب

ڈاکٹر صاحب نے آیت "هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ"۔ میں "لیظھر" کا فاعل رسول کو بنایا ہے اور ضمیر منصوب متصل کا مرجع الھدیٰ و دین الحق کو قرار دیا ہے۔

روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ اس آیت کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

هوالذى ارسل رسوله (محمدﷺ) متلبسا بالهدى اى القرآن الذى هو هدى للمتقين و دين الحق اى الثابت و قيل، دينه تعالىٰ و هو دين الاسلام ليظهره (اى الرسول)على الدين كله اى على اهل الاديان كلها فيخذ لهم او ليظهره (دين الحق) على سائر الاديان لنسخه اياها حسبما تقتضيه الحكمة فال فى الدين سواء كان الضمير للرسولﷺ ام للدين الحق للاستغراق والجملة بيان و تقرير لمضمون الجملة السابقة لان مآل الاتمام هو الاظهار۔

وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول محمد ﷺ کو ہدایت یعنی قرآن جو کہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے اور دین حق یعنی ثابت شدہ دین کے ساتھ بھیجا اور کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا دین جو کہ دین اسلام ہے تا کہ غالب کرے اس (یعنی رسول اللہ ﷺ کو تمام ادیان پر۔ یعنی تمام ادیان والوں پر غالب کر دے اور ان (اہل ادیان) کو رسوا کرے یا دین حق کو دیگر ادیان پر غالب کرے اس دین کے ان کو منسوخ کرنے کے ساتھ حکمت کے تقاضے

کے مطابق۔ پس الدین کا الف لام استغراق کے لئے ہے خواہ ضمیر رسول اللہ ﷺ کے لئے ہو یا دین حق کے لئے ہو۔ اور (یہ) جملہ گزشتہ جملہ کے مضمون کی وضاحت و بیان ہے کیونکہ اتمام کا نتیجہ بھی غالب کرنا ہی ہے۔

تفسیر بیضاوی میں ہے:

والضمير ليظهره للدين الحق اوللرسول عليه الصلوٰة والسلام

اور "لیظھرہ" میں ضمیر یا تو دین حق کے لئے ہے یا رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ازالۃ الخفاء کی جو عبارت نقل کی ہے خود اس میں ہے:۔

''الفاظ قرآنی بھی اس کو نہیں چاہتے کہ حضرت ﷺ کی حیات ہی میں دین حق کو غلبہ کامل ہو جائے۔ چنانچہ اگر لیظھرہ کی ضمیر (منصوب متصل) ہدیٰ اور دین حق کی طرف پھیریں تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول کا ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجنا سبب ہو جائے گا اس ہدایت اور دین حق کے تمام دینوں پر غالب ہونے کا۔ اس صورت میں کچھ ضروری نہیں کہ وہ غلبہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ہو جائے۔ آپ ﷺ کا مبعوث ہو جانا غلبہ کا سبب ہو گیا گو تتمہ اس غلبہ کا آنجناب ﷺ کے نائبوں کے ہاتھ پر ہوا۔ اور اگر یہ ضمیر رسول کی طرف پھیری جائے تب بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ دین حق کا غلبہ جو آنحضرت ﷺ کے نائبوں کے ہاتھ سے ہوا، بلاشبہ وہ آنحضرت ﷺ ہی کا غالب ہونا ہے''۔ (ص629 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

لیظھرہ میں ضمیر منصوب متصل سے رسول مراد ہونے کی صورت میں لیظھرہ کا فاعل اللہ تعالیٰ کے ہونے میں تو کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ ضمیر منصوب متصل سے اگر دین حق مراد ہو تو نحوی اعتبار سے احتمال ہے کہ لیظھرہ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوں یا رسول اللہ ﷺ ہوں۔ اس میں بھی یہ متعین ہے کہ لیظھرہ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوں، کیونکہ:

عام مفسرین نے ضمیر منصوب متصل کے مرجع میں تو اختلاف ذکر کیا ہے۔ لیظھرہ

کے فاعل میں اختلاف ذکر نہیں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مولانا تھانویؒ نے اپنے ترجمہ میں لیظھرہ کا فاعل اللہ تعالیٰ کے ہونے کی تصریح کی ہے۔

اور شاہ ولی اللہؒ کی عبارت میں بھی یہ ذکر ہے‘‘۔آپ ﷺ کا مبعوث ہو جانا غلبہ کا سبب ہو گیا‘‘ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت غلبہ اسلام کا سبب بنی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کو سبب بنا کر اسلام کو کل ادیان پر غلبہ دے دیا۔

نیز اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ لیظھرہ کا فاعل رسول اللہ ﷺ ہیں تو یہ بات بدیہی ہے کہ یہ نسبت مجازی ہو گی کیونکہ غالب کر دینے کا حقیقی فاعل اللہ تعالیٰ ہیں۔ نیز جب نسبت حقیقی ممکن ہو تو مجازی مراد لینا غیر روا ہو گا۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ دین حق کو دیگر ادیان پر غالب کرنا اللہ تعالیٰ کا اپنا فعل تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ مشن یا بنیادی واساسی مقصد نہیں دیا گیا تھا کہ آپ ﷺ بذات خود دین حق کو دیگر ادیان پر غالب کریں۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ غلبہ کی تحصیل کے عادی اسباب کو مختلف مراحل پر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن کسی سمجھ دار مسلم پر یہ بات مخفی نہ ہو گی کہ غلبہ کے اسباب کو اختیار کرنا اور بات ہے اور غلبہ حاصل کر لینا اور امر ہے بلکہ مسلمانوں کی اولین تاریخ اس پر شاہد ہے کہ غلبہ کے عادی اسباب بھی پورے طور پر مہیا نہ تھے اور غلبہ کا حاصل ہو جانا محض اللہ کا امر تھا۔

باب: 8

ڈاکٹر اسرار صاحب کا تصور عبادت

اللہ تعالیٰ نے جن وانس کی تخلیق کی غایت کھلے کھلے انداز میں یہ بیان فرمائی کہ وہ میری عبادت کریں۔ فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورہ ذاریات)

’’اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں‘‘۔

اسی وجہ سے قرآن پاک میں جا بجا عبادت کا حکم دیا گیا۔ فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

’’اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ‘‘۔ (سورہ بقرہ: 21)

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (سورہ بینہ)

’’اور ان (یعنی اہل کتاب) کو حکم یہی ہوا کہ عبادت کریں اللہ کی خالص کر کے اس کے واسطے دین کو‘‘۔

جو ذات انتہائی درجے کی عظمت والی ہو اس کے سامنے دلی محبت کے ساتھ انتہائی درجے کی تواضع اور ذلت اختیار کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔

امام راغب رحمہ اللہ اپنی مفردات میں لکھتے ہیں العبادة غاية التذلل و لا يستحقها الامن له غاية الافضال و هو الله تعالى 'یعنی عبادت انتہائی درجہ کی تذلل و عاجزی کا نام ہے اور اس کا مستحق صرف وہ ہے جو انتہائی درجہ کے فضل و کمال والا ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

علامہ بیضاویؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں العبادة اقصیٰ غاية الخضوع و التذلل

یعنی عبادت انتہائی درجہ کی پستی و عاجزی اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔

اس کی صورتیں یہ ہیں کہ آدمی اس کی خوشی اور اس کی تعظیم کی خاطر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے اور اپنے آپ کو خوب جھکا دے یہاں تک کہ اس کے سامنے اپنا ماتھا زمین پر ٹیک دے۔ اس کے لئے کھانا پینا چھوڑ دے۔ اس کے نام پر اپنا عزیز مال خرچ کرے۔ اس کے لئے مخصوص ہیئت اختیار کر کے اور نفس کے تقاضوں کو ترک کر کے سفر کرے اور اس کے گھر کے گرد دیوانہ وار چکر لگائے۔ اور اس کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اپنی جان تک قربان کر دے اور اپنا خون زمین پر بہا دے اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام بھی ہیں لہٰذا ان کو پورا کرنا اطاعت بھی ہے لیکن ایسی اطاعت جس میں انتہائی درجے کی عاجزی اور تذلل ظاہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور جہاد عبادت کے وہ کام ہیں جن کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

عبادت کی احسن اور علی وجہ الاتم ادائیگی چونکہ اس وقت ہو سکتی ہے جب دل محبت اور تعظیم کے جذبے سے بھرا ہوا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کو ذہنی و قلبی فراغت اور یکسوئی حاصل ہو۔ یہ یکسوئی اس وقت ممکن ہے جب آدمی کی ایک تو بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہوں اور دوسرے وہ آپس کے جھگڑوں اور رنجشوں سے امن میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں بنیادی ضرورتیں پوری ہونے کے لئے مسلمانوں کے افراد اور مسلمانوں کی اجتماعیت و حکومت کو احکام دیئے ہیں وہیں آپس کے جھگڑوں اور رنجشوں سے بچنے کے لئے آپس کے معاملات کے بارے میں احکام اور ہدایات عطا فرمائیں۔ ان احکام کا بنیادی نکتہ ہی یہی ہے کہ آپس کے جھگڑے کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

ہماری اس گزارش سے یہ بات حاصل ہوئی کہ مسلمان کی زندگی میں عبادت کو اصل کا مقام حاصل ہے اور معاملات کے احکام اس غرض سے ہیں کہ وہ عبادات جو کہ تخلیق کی غرض و غایت ہے اس کی ادائیگی میں یہ مدد و معاون ہیں۔

قرآن وسنت میں ارکان اربعہ کے لئے لفظ عبادت کا استعمال

(1) یہ کہنا کہ قرآن وسنت میں نماز، زکوۃ، روزہ اور حج کو کہیں عبادات نہیں کہا

گیا درست نہیں، دیکھئے مندرجہ ذیل آیات و احادیث۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ۔ (سورہ مومن: 60)

اور کہتا ہے تمہارا رب مجھ کو پکارو میں قبول کروں گا تمہاری پکار کو۔ بے شک جو لوگ تکبر کرتے ہیں میری عبادت سے وہ داخل ہوں گے جہنم میں ذلیل ہو کر۔

اس آیت کریمہ میں دعا کو عبادت کہا گیا ہے۔

عن عطاء قلت لعائشة اخبر يني باعجب مارايت من رسول الله ﷺ قالت اى شانه لم يكن عجبا اتانى الليلة فدخل معى فى لحافى ثم قال ذرينى اعبد ربى فقام فتوضا ثم قام ليصلى۔ (ابن حبان۔ کتاب اخلاق رسول الله ﷺ)

عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ مجھے آپ رسول اللہ ﷺ کی سب سے عجیب بات بتائیے جو آپ نے دیکھی ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ کی کون سی بات عجیب نہ تھی۔ آپ ﷺ ایک رات میرے پاس آئے اور میرے ساتھ میرے لحاف میں داخل ہو گئے پھر فرمایا مجھے چھوڑ کہ میں اپنے رب کی عبادت کروں۔ پھر اٹھے، وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔

3-عن انس قال جاء ثلاثة رهط الى ازواج النبى ﷺ يسألون عن عبادة النبى ﷺ فلما اخبروا بها كانهم تقالوها فقالوا اين نحن من النبى ﷺ وقد غفر الله ماتقدم من ذنبه و ما تأخر۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں تین آدمی نبی ﷺ کی ازواج کے پاس گھر میں نبی ﷺ کی عبادت کا معمول معلوم کرنے آئے۔ جب ان کو بتایا گیا (کہ آپ ﷺ اتنی نماز پڑھتے ہیں اور اتنی تلاوت کرتے ہیں اور اتنے روزے رکھتے ہیں) تو انہوں نے اس کو کچھ کم سمجھا......

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذکر کیا:

یَا ابۡنَ آدَمَ تَفَرَّغۡ لِعِبَادَتِی اَمۡلَأۡ صَدۡرَکَ غِنًی و اَسُدُّ فَقۡرَکَ وَاِلَّا تَفۡعَلۡ مَلَاتُ یَدَکَ شُغۡلاً وَلَمۡ اَسُدَّ فَقۡرَکَ۔

"اے ابن آدم! تو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا میں تیرے سینے کو غنا سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو بند کردوں گا اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو تیرے ہاتھ کو (دنیوی) مشاغل سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو بند نہیں کروں گا"۔

جب دنیوی مشاغل بھی عبادت ہی ہیں تو پھر یہ کہنا کہ تو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا یعنی اپنے کچھ اوقات اس کے لئے فارغ کر لے بے معنی سی بات ہے حالانکہ حدیث کی بات بے معنی نہیں ہوسکتی۔

5- ایک اور حدیث میں ہے حضرت ابو ہریرہ ؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

سَبۡعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیۡ ظِلِّهٖ یَوۡمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلُّه، اِمَامٌ عَادِلٌ و شَابٌّ نَشَأَ فِیۡ عِبَادَةِ اللّٰهِ ...... الخ

سات آدمی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دیں گے جس دن ان کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا (ایک) عادل حکمران (دوسرا) وہ جوان جس نے اللہ کی عبادت ہی میں پرورش پائی ہو۔

مذکورہ بالا نصوص کی وجہ سے امت کے سب خاص و عام عبادت کا وہی مفہوم سمجھتے رہے جو امام راغبؒ اور علامہ بیضاویؒ کے حوالہ سے اوپر نقل ہوا۔ مزید براں۔

1- امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب شمائل ترمذی میں ایک عنوان باندھا ہے "باب ماجاء فی عبادة النبی ﷺ" اور اس عنوان کے تحت وہ روایتیں جمع کی ہیں جن میں آپ ﷺ کی نماز وغیرہ کا ذکر ہے۔

2- علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں "هدیه ﷺ فی العبادات" کے عنوان کے تحت

مروجہ عبادات کو ذکر کیا ہے۔

3- شاہ اسماعیل شہیدؒ تقویت الایمان میں "شرك فی العبادة" کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں۔ "بعضے کام تعظیم کے اللہ نے اپنے واسطے خاص کئے ہیں کہ ان کو عبادت کہتے ہیں جیسے سجدہ و رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا اور اس کے نام پر مال خرچ کرنا اور اس کے نام کا روزہ رکھنا اور اس کے گھر کی طرف دور دور سے قصد کر کے سفر کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لے کہ یہ لوگ اس گھر کی زیارت کو جاتے ہیں۔

4- امام غزالیؒ اپنی کتاب احیاء العلوم میں لکھتے ہیں۔

وقداسسته علی اربعة ارباع و هی ربع العبادات و ربع العادات و ربع المهلکات و ربع المنجیات۔

(میں نے اس کتاب کے چار حصے کئے ہیں یعنی عبادات، عادات، مہلک باتیں اور نجات دینے والی باتیں) اور عبادات کے تحت جو دس عنوان لائے ہیں وہ یہ ہیں "کتاب العلم، کتاب قواعد عقائد، کتاب اسرار طہارت، کتاب اسرار نماز، کتاب اسرار زکوۃ، کتاب اسرار روزہ، کتاب اسرار حج، کتاب آداب تلاوت قرآن، کتاب اذکار و ادعیہ، کتاب ترتیب اوقات۔"

ڈاکٹر اسرار صاحب مودودی صاحب کے اتباع میں عبادت کا کچھ اور ہی مطلب بتاتے ہیں حالانکہ ان کے پاس اس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ اس کے لئے مذکورہ بالا نصوص کے باوجود اول تو انہوں نے قرآن و سنت میں نماز، روزے وغیرہ کو عبادت کہنے ہی کی نفی کر دی۔ لکھتے ہیں:

"عملی ستون چار ہیں نماز، زکوۃ، حج اور رمضان کے روزے۔ ان ہی کو ہم عبادات کہہ دیتے ہیں۔ اگرچہ پورے قرآن مجید میں ان کے لئے لفظ عبادت کہیں نہیں آیا، عبادت کا لفظ اسی مفہوم میں ہے جس کی میں نے تشریح کی ہے" (ص 14)

''حالانکہ ان کے لئے کتاب و سنت میں کہیں بھی عبادات کا لفظ استعمال نہیں ہوا، حدیث میں ان کو ارکان اسلام کہا گیا ہے عبادات نہیں''
(میثاق جون 83ء)

اور عبادات کا جو تصور پوری امت میں رہا ہے اس کو وہ محدود بلکہ مسخ شدہ تصور کہتے ہیں۔

(2) ''نماز کو ہم عبادت سمجھتے ہیں۔ روزہ عبادت ہے۔ زکوۃ عبادت ہے۔ حج عبادت ہے۔ بلاشبہ یہ عبادات ہیں۔ لیکن جب عبادت کو ان میں منحصر کرلیا جائے گا اور جب یہ سمجھ لیا جائے گا کہ بس ان کو ادا کرنے سے عبادت کا حق ادا ہو گیا تو تصور دین محدود ہی نہیں بلکہ مسخ ہو جائے گا'' (ص18 مطالبات دین)

ڈاکٹر اسرار صاحب کے نزدیک ارکان اربعہ اصل عبادت کے لئے مددگار ہیں خود اصل عبادت نہیں۔ لکھتے ہیں:

''عبادت نماز، روزہ، زکوۃ اور حج میں محدود و منحصر نہیں بلکہ جیسا کہ میں بعد میں عرض کروں گا یہ وہ اعمال ہیں جو پوری زندگی کو خدا کی بندگی اور غلامی میں دینے کے لئے انسان کو تیار کرتے ہیں۔ یہ چیزیں حقیقی عبادت کی ادائیگی میں ممد و معاون بنتی ہیں ان کے ذریعے سے انسان میں وہ قوتیں پیدا ہوتی ہیں جو اس عظیم عبادت کے حقوق کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کو اگر انسان اپنی زندگی میں قائم کرلے تب اس کے لئے آسان ہو گا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اس روش کو اختیار کرلے۔ جس کا نام عبادت ہے۔'' (ص19 مطالبات دین)

3- ''اس سلسلہ میں جو سب سے زیادہ محدود تصور ہے اور جو ہمارے ہاں سب سے زیادہ عام ہے اور جو عوام الناس کے ذہنوں میں صدیوں کے انحطاط کے بعد پوری طرح راسخ ہو گیا ہے وہ یہی ہے کہ عبادت سے مراد نماز، روزہ، زکوۃ اور حج ہے اور بس یہ ہیں عبادات باقی زندگی عبادت سے خارج ہے''۔ (ص 22 مطالبات دین)۔

''اس سے ذرا وسیع تصور جو پیدا ہوا ہے اور خوش قسمتی سے اس دور میں بہت سے اہل قلم کی کاوشوں، کوششوں کے نتیجے میں اب یہ بات ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کی اچھی خاصی تعداد کے سامنے واضح ہو چکی ہے کہ عبادت پوری زندگی میں کامل اطاعت کا نام ہے۔'' (ص19 مطالبات دین)۔

ڈاکٹر صاحب نے جن بہت سے اہل قلم کا ذکر کیا ہے ان میں سرفہرست جناب مودودی صاحب ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا مرحوم (مودودی صاحب) میرے والد کی عمر کے تھے۔ پھر میرے محسن بھی تھے کہ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے مجھے دین کا صحیح مفہوم اور ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہوا تھا''۔ (میثاق ستمبر 84ء ص28)۔

دیکھئے مودودی صاحب تفہیمات جلد اول میں رقم طراز ہیں:۔

''غلط کہتا ہے جو کہتا ہے کہ عبادت صرف تسبیح و مصلّٰی اور مسجد و خانقاہ تک محدود ہے۔ مومن صالح صرف اسی وقت تک عبادت گزار نہیں ہوتا جب وہ دن میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہے اور بارہ مہینوں میں ایک مہینے کے روزے رکھتا ہے اور سال میں ایک وقت زکوۃ دیتا ہے اور عمر بھر میں ایک بار حج کرتا ہے بلکہ درحقیقت اس کی ساری زندگی عبادت ہی عبادت ہے۔ جب وہ کاروبار میں حرام کے فائدوں کو چھوڑ کر حلال کی روزی پر قناعت کرتا ہے تو کیا وہ عبادت نہیں کرتا۔ جب وہ معاملات میں ظلم و جھوٹ اور فریب اور دغا سے پرہیز کر کے انصاف اور راست بازی سے کام لیتا ہے تو کیا یہ عبادت نہیں ہے۔ پس حق یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی پیروی اور اس کی شریعت کے اتباع میں انسان دین اور دنیا کا جو کام بھی کرتا ہے وہ سراسر عبادت ہے حتیٰ کہ بازاروں میں اس کی خرید و فروخت اور اپنے اہل و عیال میں اس کی معاشرت اور اپنے خالص دنیوی اشغال میں اس کا انہماک بھی عبادت ہے''۔ (ص 67 طبع جدید)

نیز لکھتے ہیں:

''افسوس کہ عبادت کے اس صحیح اور حقیقی مفہوم کو مسلمان بھول گئے۔ انہوں نے چند مخصوص اعمال کا نام عبادت رکھ لیا اور سمجھے کہ بس انہی اعمال کو انجام دینا عبادت ہے اور انہی کو انجام دے کر عبادت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس عظیم الشان غلط فہمی نے عوام و خاص دونوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے''۔
(ص 71 طبع جدید)

اندازہ کیجئے کہ عبادت قرآن کی ایک اصطلاح ہے۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ امت قرآن کی بنیادی اصطلاحات کا مطلب ہی بھول جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں موجود ہیں، صحابہ کے اقوال موجود ہیں، قدیم سے قدیم تفاسیر موجود ہیں، حکمائے امت کی کتابیں موجود ہیں پھر ایک ایسی اصطلاح جس کا تعلق ان حضرات کے بقول زندگی کے ہر ہر لمحہ سے ہے اور ہر ہر لمحہ کی اطاعت و تابعداری سے ہے امت کے عوام وخواص سب ہی اس کے بارے میں دھوکہ اور عظیم الشان غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں عجیب حیرت انگیز دعوی ہے جس کی دلیل بس خوش کن لفاظی ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے اپنے دعوے پر ایک دلیل دی ہے۔ لکھتے ہیں:

"وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (سوره بينه)

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم علیحدہ ہے اور اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوۃ کا حکم علیحدہ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان فرض عبادات سے علیحدہ ایک عبادت انسان سے مطلوب ہے۔ اس عبادت کو مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ عبادت اس رویہ اور طرز عمل کا نام ہے کہ انسان یکسو ہو کر مخلصانہ اپنی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دے......الخ''

ڈاکٹر صاحب کی یہ دلیل اپنے دعوے پر قطعی نہیں ہے کیونکہ احتمال ہے کہ یہاں

خاص کا عطف عام پر ہو اور یہ ضابطہ ہے کہ جب دوسری بات کا احتمال موجود ہو تو استدلال باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں یہاں لیعبدوا کے لئے عبادت کا معنی ہونا کونسا ضروری ہے یہ باب کرم یکرم سے ہو سکتا ہے جس کا مصدر عبودۃ وعبودیت ہے اور معنی غلامی کا ہے (دیکھئے مصباح اللغات)۔

تنبیہ:

آگے ہم دو باتوں پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

1- اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری ایک مستقل حکم ہے اس کے لئے ہم عبادت کی اصطلاح نہ بھی استعمال کریں تب بھی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اپنی جگہ ضروری ہے قرآن پاک میں اس کی واضح صراحت موجود ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً **(سوره بقره: 208)**

''اے ایمان والو! اسلام و تابعداری میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔''

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ **(سوره نساء: 59)**

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی''۔

جب کامل اطاعت کو بتانے کے لئے مستقل اصطلاح موجود ہے تو اس کی خاطر عبادت کی شرعی اصطلاح کو بدلنے کی کوئی ضرورت و مجبوری بھی نہیں۔

2- خرید و فروخت کرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، بیوی سے دل لگی کرنا، صحبت کرنا، ورزش کرنا، رشتہ داروں سے ملنا یہ سب باتیں ایسی ہیں جو عام طور پر مباح ہیں کہ ان کے کرنے پر ثواب نہیں اور نہ کرنے پر گناہ نہیں البتہ اس وقت بھی یہ ضروری ہے کہ اس کو شریعت کے موافق کیا ہو خلاف نہ کیا ہو۔ اگر خرید و فروخت کی لیکن ایسے طریقے پر جس سے دین و شریعت کا کوئی حکم ٹوٹتا ہو تو اس پر گناہ ہوتا ہے۔ غرض دین کے موافق کرنے پر وہ مباح ہے ورنہ ناجائز طریقے کی وجہ سے خرید و فروخت بھی ناجائز کہلائے گی۔

البتہ جب ہم کسی مباح کو جائز طریقے پر کریں گے اور اس کے کرنے میں کسی نیکی کی نیت کر لیں مثلاً کھانا کھاتے ہوئے یہ نیت کر لیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی طاعات پر قوت حاصل ہوگی، مال اس نیت سے کمائے کہ آمدنی کو غریبوں کی مدد میں اور دین کی اشاعت میں خرچ کروں گا، ورزش جہاد کی تیاری کی نیت سے کرتا ہے، بیوی سے صحبت عفت و پاکدامنی کے لئے یا نیک اولاد کے حصول کی نیت سے کرتا ہے تو اس نیت کی وجہ سے اس کام میں ثواب ملتا ہے اور چونکہ عبادات ہی وہ کام ہیں جو ثواب کے لئے مقرر ہوئے ہیں تو جب نیک نیتی کی وجہ سے مباح کام پر بھی ثواب ملتا ہے تو اس کو بھی مجازا عبادت کہہ دیتے ہیں۔

امام غزالیؒ کیمیائے سعادت میں فرماتے ہیں۔

''لہٰذا جو شخص اس لئے کھانا کھاتا ہے کہ اس کو علم و عمل پر قوت حاصل ہو اور راہ آخرت پر چلنے کی طاقت میسر ہو اس کا کھانا کھانا عبادت ہے اور اسی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کو ہر چیز پر ثواب ہوتا ہے (یعنی جب کہ وہ اس کو شعور کے ساتھ اچھی نیت سے کرے) یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی جو وہ اپنے منہ میں ڈالے یا اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے اور آپ ﷺ نے یہ اس لئے فرمایا کہ ان جیسے سب کاموں سے (کامل اور باشعور) مومن کا مقصد راہ آخرت ہوتی ہے''۔

باب: 9

ایک غیر فرض کام کو فرض عین قرار دینا

ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں۔

"وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ"۔

ہر انسان پر حجت قائم کر دی ہے کہ خواہ وہ کتنی ہی کم اور کیسی ہی معمولی استعداد کا حامل کیوں نہ ہو۔ فلسفہ و منطق اور علوم و فنون سے کتنا ہی نابلد اور زبان و ادب کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے کتنا ہی ناواقف کیوں نہ ہو وہ قرآن سے تذکر کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی طبع سلیم اور فطرت صحیح ہو اور ان میں ٹیڑھ اور کجی راہ نہ پا چکی ہو اور وہ قرآن کو پڑھتے ہوئے اس کا ایک سادہ مفہوم روانی کے ساتھ سمجھتا چلا جائے ......

لیکن تذکر بالقرآن کے لئے بھی عربی زبان کا بنیادی علم بہرحال ناگزیر ہے اور متن کے ساتھ ساتھ قرآن کے کسی مترجم نسخے میں ترجمہ دیکھتے رہنا اس مقصد کے لئے قطعاً ناکافی ہے اور میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ عربی کی اس قدر تحصیل کہ انسان قرآن مجید کا ایک رواں ترجمہ از خود سمجھ سکے اور تلاوت کرتے ہوئے بغیر متن سے نظر ہٹائے اس کے سرسری مفہوم سے آگاہ ہوتا چلا جائے ہر پڑھے لکھے مسلمان کے لئے فرض عین کا درجہ رکھتا ہے۔

...... اور میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسا مسلمان جس نے کچھ بھی پڑھا لکھا ہو کجا یہ کہ غیر ملکی زبان تک سیکھی ہو بی اے ایم اے پاس کیا ہو، ڈاکٹری اور انجینئرنگ جیسے مشکل علوم و فنون حاصل کئے ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں

اتنی سی عربی نہ سیکھنے پر کیا عذر پیش کر سکے گا جس سے وہ اس کے کلام پاک کا فہم حاصل کر سکتا۔ حضرات! میں پورے خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا عربی سیکھ کر قرآن کا فہم حاصل کرنے سے باز رہنا اللہ کے کلام کا تمسخر اور استہزاء ہی نہیں بلکہ اس کی تحقیر و توہین ہے اور آپ خود سوچ لیں کہ اپنے اس طرز عمل سے ہم اپنے آپ کو اللہ کی کیسی شدید باز پرس اور کتنی سخت عقوبت کا مستحق بنا رہے ہیں (مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق ص 34-35)

مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ کے اصلاح کرنے کے بعد ڈاکٹر اسرار صاحب کی ایک اور عبارت یوں ہے۔

لیکن پڑھے لکھے لوگ جنھوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا خاصا عرصہ صرف کر دیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم وفنون حاصل کئے ہوں مادری ہی نہیں بلکہ غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم گردانے جائیں اور اس اعراض عن القران کی سزا تلاوت کے ثواب سے بڑھ جائے'' (خط کشیدہ الفاظ مولانا یوسف بنوری کے بتائے ہوئے ہیں)

اس دوسری عبارت میں ڈاکٹر اسرار صاحب نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو پڑھے لکھے ہوں اور جنہوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا خاصا عرصہ صرف کیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم وفنون حاصل کئے ہوں، مادری ہی نہیں بلکہ غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں جب کہ پہلی عبارت جو کہ قرآن مجید کے حقوق میں موجود ہے اس میں ہر اس مسلمان کو شامل کیا ہے جس نے کچھ بھی پڑھا لکھا ہو۔

مولانا بنوری رحمہ اللہ کے الفاظ پر ایک اور نظر ڈالیں ......'' اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے'' ...... الخ مولانا رحمہ اللہ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ یہ سمجھنا بھی صرف عربی سیکھنے سے ہو محض ترجمہ دیکھنا کافی نہ ہوگا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کا یہ

فرمانا کہ تذکر بالقرآن کے لئے بھی عربی زبان کا بنیادی علم بہر حال ناگزیر ہے اور متن کے ساتھ ساتھ قرآن کے کسی مترجم نسخے میں ترجمہ دیکھتے رہنا اس مقصد کے لئے قطعاً ناکافی ہے محض بے دلیل بات ہے۔ اگر یہ ایسا ہی ناگزیر تھا تو خاندان ولی اللہؒ اور پھر شیخ الہند رحمہ اللہ اور دیگر اکابرین کو ترجمہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی بلکہ اس طرح سے تو انہوں نے گویا ایک ''فرض عین'' کے ترک کرانے میں اعانت کی۔ آخر ترجمہ سے استفادہ بھی تو وہی لوگ کریں گے جو کچھ پڑھے لکھے ہوں گے۔

اصل چیز تو قرآن پاک کو سمجھنا ہے۔ خواہ وہ عربی اور دیگر علوم ضرور یہ سیکھ کر ہو یا ترجمہ دیکھ کر یا کسی عالم سے ترجمہ کروا کر۔ اب اس دور میں دیکھا جائے تو احوط طریقہ کسی عالم سے ترجمہ کروا کر سمجھنا ہے، عربی زبان سیکھ بھی لے تب بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بات صرف الفاظ کی نہیں ہوتی بلکہ ان الفاظ اور اس کلام کی مراد کو بھی سمجھنا اصل مرحلہ ہوتا ہے۔ اردو زبان کی کتنی عبارتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام اردو پڑھا لکھا شخص نہیں سمجھ سکتا تو قرآن کی عبارت کو محض عربی کے کچھ بنیادی قواعد سیکھ کر کیسے اطمینان ہو سکتا ہے کہ ہر شخص اس کو اور اس کی مراد کو سمجھ لے گا۔ بلکہ یہ تو عام مشاہدہ ہے کہ کتنے ہی لوگ کچھ عربی کے قواعد سیکھ کر قرآن میں اپنی رائے دینے پر جری ہو جاتے ہیں اور ہمچو ما دیگرے نیست کا نعرہ لگانے لگتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تذکر ہو گا قرآن پاک کے ترجمہ کو سمجھنے سے اور ترجمہ سمجھنے کے متعدد طریقے ہیں۔ کسی ایک طریقے میں تذکر کو مقید کر دینا درست نہیں اور جب یہ درست نہیں تو عربی زبان کا بنیادی علم سیکھنا تذکر کے لئے شرط بھی نہیں اور جب شرط نہیں تو فرض عین بھی نہیں۔ باقی رہی عربی زبان کی فضیلت تو وہ مسلم ہے۔ اور اگر قرآن و حدیث سمجھنے کی غرض سے عربی زبان کی تحصیل کے لئے ترغیب دی جائے تو انتہائی مناسب ہے لیکن اس کے ساتھ کسی اچھے عالم یا بصورت دیگر کسی معتبر تفسیر کی احتیاج بھی مدنظر رہے۔ یہ محض تذکر کے لئے بھی موجودہ دور میں ضروری ہے۔

باب: 10

مزارعت کے بارے میں غیر منصفانہ فکر

ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں:۔

''اس مسئلہ میں فقہاء امت کے درمیان میں اختلاف ہے، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر قسم کی مزارعت حرام ہے ABSENTEE LANDLORDISM کا ان کی رائے میں اسلام میں کوئی امکان سرے سے موجود نہیں۔ بعض دوسرے فقہاء نے ان احادیث پر غور کرنے کے بعد اس میں استحسان اور مصالح مرسلہ کے اصول کے تحت کچھ گنجائشیں نکالی ہیں اور یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ اس دور کے خاص حالات میں ایک موجود الوقت نظام کو کلیۃً بدلنا ممکن نہ تھا، لہٰذا کچھ ناگزیر شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش پیدا کی گئی تھی۔ ورنہ حضور اکرم ﷺ نے تو مزارعت پر لفظ ربوٰ کا اطلاق کیا ہے......

ہمارے ہاں مزارعت کی جو شکلیں رائج ہیں اس میں پھر بھی مالک بیج اور بہت سی دوسری چیزوں میں شامل ہوتا ہے۔ یہ اس حرام کو حلال بنانے کے لئے کچھ اضافی شرائط عائد کی گئی ہیں۔ ورنہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ آنکھیں کھول دینے کے قابل ہے۔ مجھے امام صاحب کی اس رائے سے کاملۃً اتفاق ہے'' (اسلام کا معاشی نظام ص 28,27)

''یہ بات قابل توجہ ہے کہ جب ہماری اکثریت امام ابوحنیفہ کی فضیلت بیان کرتی ہے تو ان کو امام اعظم اور سید الفقہاء قرار دیتی ہے اور ان کے بعض فتاویٰ کو درست ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے مگر ''میٹھا

میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو' کے مصداق ایسے اہم معاملات پر ان کے فتویٰ کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی'' (ایضاً حاشیہ 28)

ڈاکٹر صاحب کی یہ عبارت کئی اعتبار سے قابل اعتراض ہے۔ اول تو ان کا انداز تکلم نہایت غیر منصفانہ ہے بلکہ سوقیانہ ہے۔ ان کے الفاظ تو ملاحظہ فرمائیں۔

(i) چونکہ اس دور کے خاص حالات میں ایک موجود الوقت نظام کو کلیۃً بدلنا ممکن نہ تھا لہٰذا کچھ ناگزیر شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش پیدا کی گئی تھی ورنہ نبی ﷺ نے تو مزارعت پر لفظ ربوا کا اطلاق کیا ہے۔

(ii) یہ اس حرام کو حلال بنانے کے لئے کچھ اضافی شرائط عائد کی گئی ہیں ورنہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

(iii) مجھے امام صاحب کی اس رائے سے کاملۃً اتفاق ہے۔

(iv) مگر میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کے مصداق ایسے اہم معاملات پر ان کے فتوے کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

اندازہ کیجئے ڈاکٹر اسرار صاحب کی جانب سے یہ سب کچھ اس اعتراف کے بعد ہے ''میں یہ بات کئی بار عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ میں عالم دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں ہوں مجتہد ہونا تو بہت دور کی بات ہے فقہ کے متعلق میرا مطالعہ محدود ہے'' (میثاق 84ء ص 44)

اور فقہ ہی کیا ڈاکٹر اسرار صاحب کو نہ تو اصول فقہ کا پتہ ہے، نہ اصول حدیث کا پتہ ہے، نہ ہی علم حدیث پر ان کو دسترس حاصل ہے، نہ ان کو یہ معلوم ہے کہ اصول فتاوی کیا ہیں۔ ہاں ان کو اسلاف پر زبان طعن دراز کرنے کا پتہ ہے۔

مزارعت کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں دو رائیں تھیں

جہاں ایک طرف امام صاحب رحمہ اللہ کی دلیل نَھٰی عَنِ الْمُخَابَرَۃِ جیسی حدیث ہے وہاں دوسرے مجتہدین کی دلیل دوسری بہت سی روایتیں ہیں۔ مشکوٰۃ میں باب

المساقاۃ والمزارعۃ کے تحت دیکھیں تو یہ احادیث ہیں۔

عن عبداللّٰہ بن عمر ان رسول اللّٰہ ﷺ دفع الی یھود خیبر نخل خیبر وارضھا علی ان یعتملوھا من اموالھم و لرسول اللہ ﷺ شطر ثمرھا (رواہ مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کو خیبر کے کھجور کے باغ اور اس کی زمین اس شرط پر دی کہ وہ اپنے مال سے اس پر کام کریں اور رسول اللہ ﷺ کے لئے اس کے پھل کا نصف ہوگا۔

وفی روایۃ البخاری ان رسول اللّٰہ ﷺ اعطی خیبر الیھود ان یعملوھا و یزرعوھا ولھم شطر ما یخرج منھا۔

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کو خیبر کی زمین عطا کی کہ وہ اس پر کام کریں اور زراعت کریں اور اس کی پیداوار میں سے ان کے لئے نصف ہوگا۔

عن عمرو قال قلت لطاؤس لو ترکت المخابرۃ فانھم یزعمون ان النبی ﷺ نھی عنہ قال ای عمرو...... ان اعلمھم اخبرنی یعنی ابن عباس ان النبی ﷺ لم یَنْہَ عنہ ولکن قال ان یمنح احدکم اخاہ خیرلہ من ان یاخذ علیہ خرجا معلوما (متفق علیہ)

عمرو رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس رحمہ اللہ سے کہا کہ کاش آپ مخابرہ ترک کر دیتے کیونکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے انہوں نے (جواباً) کہا اے عمرو مجھ کو خبر دی بڑے عالم یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہ نبی ﷺ نے اس سے منع نہیں کیا لیکن یہ فرمایا کہ تم میں سے ایک کا اپنے بھائی پر سخاوت کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اس پر مقررہ خراج لے۔

اور مزارعت کے جواز کے قائل مجتہدین رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ممانعت کو حدیثوں ہی کی وجہ سے مقید مانتے ہیں۔

عن حنظلۃ بن قیس عن رافع بن خدیج قال اخبرنی عمای انھم کانوا یکرون الارض علیٰ عھد النبی ﷺ بما ینبت علی الاربعاء اوشیٔ یستثنیہ صاحب الارض فنھانا النبی ﷺ عن ذالك فقلت لرافع فکیف ھی بالدینار والدرھم فقال لیس بھا بأس و کان الذی نھی عن ذالك مالو نظر فیہ ذوو الفھم بالحلال والحرام لم یجیزوہ لمافیہ من المخاطرۃ۔ (متفق علیہ)۔

حنظلہ بن قیس رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ مجھے میرے دو چچاؤں نے بتایا کہ لوگ نبی ﷺ کے دور میں زمین کو اجرت پر دیتے تھے اس پیداوار کے عوض میں جو نالوں پر ہوتی تھی یا اس کے عوض میں جس کو مالک زمین اپنے لئے خاص کر لیتا تھا تو نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ حنظلہ کہتے ہیں کہ میں نے رافع رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ دراہم و دنانیر کے عوض میں کیسا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ گویا کہ جس سے روکے گئے وہ وہ چیز ہے کہ اگر حلال وحرام کی فہم رکھنے والے اس میں غور کریں تو دھوکہ ہونے کی بنا پر اس کی اجازت نہ دیں۔

عن رافع بن خدیج قال کنا اکثر اھل المدینۃ حقلا و کان احدنا یکری ارضہ فیقول ھذہ القطعۃ لی و ھذہ لك فربما اخرجت ذہ ولم تخرج ذہ فنھاھم النبی ﷺ (متفق علیہ)

رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اکثر اہل مدینہ زراعت کرتے تھے اور ہم میں سے ایک اپنی زمین کرائے پر دیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ قطعہ (زمین) یعنی اس کی پیداوار میرے لئے ہے اور یہ تیرے لئے ہے۔ تو بسا اوقات اس حصہ میں پیداوار ہوتی اور اس حصہ میں نہ ہوتی تو نبی ﷺ نے اس طرح کے معاملہ سے منع فرمایا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ باب ماجاء فی المزارعۃ میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

والعمل علیٰ ھذا عند بعض اھل العلم من اصحب النبی ﷺ وغیر ھم لم یروا بالمزارعۃ بأسا علی النصف والثلث والربع و اختار بعضھم ان یکون البذر

من رب الارض و هوقول احمد و اسحاق و كره بعض اهل العلم المزارعة بالثلث و الربع ولم يروا بمساقاة النخيل باسا و هو قول مالك بن انس و الشافعي ولم ير بعضهم ان يصح شيء من المزارعة الاان تستاجر الارض بالذهب والفضة۔

نبی ﷺ کے اصحاب میں سے بعض اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ان کے علاوہ دوسروں نے نصف تہائی، چوتھائی پیداوار پر مزارعت میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ان میں سے بعض نے اس کو اختیار کیا کہ بیج زمین کے مالک کا ہو اور یہ قول احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راہو یہ کا ہے۔بعض اہل علم نے مزارعت تہائی اور چوتھائی پر مکروہ سمجھی لیکن تہائی اور چوتھائی پیداوار پر (باغوں میں اسی معاملہ یعنی) مساقات میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔یہ قول مالک بن انس اور شافعی رحمہما اللہ کا ہے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ مزارعت کی کوئی صورت درست نہیں مگر یہ کہ زمین کو سونے یا چاندی کے عوض کرائے پر لے لیا جائے۔

صاحب مشکوٰۃ "المساقاة والمزارعة" کی فصل ثالث میں یہ روایت لائے ہیں:

عن قيس بن مسلم عن ابی جعفر قال ما بالمدينة اهل بيت هجرة الا يزرعون على الثلث و الربع و زارع علی وسعد بن مالك و عبد الله بن مسعود و عمر بن عبدالعزيز والقاسم و عروة و آل ابی بكر و آل عمر و آل علی و ابن سيرين و قال عبدالرحمٰن بن الاسود كنت اشارك عبدالرحمٰن بن يزيد فی الزرع و عامل عمر الناس علیٰ ان جاء عمر بالبذر من عنده فله الشطر و ان جاءوا با لبذر فلهم كذا (رواه البخاری)

ابوجعفر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں کوئی بھی ہجرت والا گھر نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے مکین تہائی اور چوتھائی پیداوار پر کاشت کرتے ہیں اور حضرت علی، حضرت سعد بن مالک، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ، آل ابوبکر، آل عمر، آل علی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے مزارعت کی، عبدالرحمٰن بن اسود کہتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن یزید کے ساتھ کاشت میں مشارکت کی۔عمر رضی اللہ

عنہ نے لوگوں کے ساتھ معاملہ یعنی مزارعت کی اس شرط کے ساتھ کہ اگر بیج عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے ہوگا تو ان کو نصف پیداوار ملے گی اور اگر وہ بیج لائیں گے تو ان کے لئے اتنا حصہ ہوگا۔

ان حوالوں سے یہ معلوم ہو گیا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں بھی مزارعت جاری تھی اور وہ اس کو جائز سمجھتے تھے۔حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے بھی ممانعت کا قول آیا لیکن انہوں نے اس کا دوسرا محمل بتایا۔حالانکہ خلفائے راشدین خصوصاً اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عموماً تو تاریخ گر اور دنیا کا نقشہ بدلنے والے تھے۔اگر سب کی یہی رائے ہوتی کہ مزارعت مطلقاً حرام ہے تو ان کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ اس کو بالکل نیست و نابود کر دیتے۔کیا یہ سلف صالحین پر طعن نہ ہو جائے گا کہ باوجود یہ جاننے کے کہ یہ سود اور ربوا ہے انہوں نے رائج الوقت نظام کی بالکلیہ تبدیلی کو ممکن نہ جانتے ہوئے اس کی کچھ گنجائش پیدا کی۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کی قلابازی

ایک طرف ڈاکٹر اسرار صاحب مزارعت کے ربوا ہونے کی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے کاملۃ اتفاق کرتے ہی لیکن دوسری طرف خراجی زمین کو مزارعت پر دینے کو جائز سمجھتے ہیں اور وہ بھی محض اس وجہ سے کہ زمین دینے والا ایک فرد نہیں ہے بلکہ ریاست ہے۔لکھتے ہیں:

''اس زمین کے مزارع ریاست کے مزارع ہوں گے اور یہ مزارعت موروثی چل سکتی ہے''۔(میثاق اپریل 85ء)

بھلا بتائیے ایک معاملہ کی حرمت کی وجہ جب معلوم ہوگئی کہ ربوا یعنی سود ہے تو کیا کسی ریاست کو خواہ وہ اسلامی ریاست ہی ہو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سودی معاملہ کرے۔ دین اسلام میں تو ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہے۔

باب: 11

بغیر دلیل مضاربت کو ناپسندیدہ کہنا

اسلام کا معاشی نظام ص 26 پر ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں۔

''ایک شخص محنت کر سکتا ہے، دکان چلا سکتا ہے مگر اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے اور کسی دوسرے شخص کے پاس زائد سرمایہ موجود ہے۔ اب یہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں ایک کی محنت ہوگی دوسرے کا سرمایہ۔ اس صورت میں محنت اور سرمایہ کا امتزاج وجود میں آئے گا اور اس کا نام مضاربت ہے۔ یہ دین میں جائز تو ہے مگر پسند نہیں جیسے مثلاً طلاق، اگر کسی کے پاس سرمایہ ہی اتنا ہے کہ جس پر خود اس کی معیشت کا دارومدار چل سکتا ہے تو وہ خود دکان لگائے محنت کرے اور رزق حلال کمائے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس اپنی ضروریات کے لئے کوئی اور ذریعہ موجود ہے اور وہ فاضل سرمایہ اپنے ایسے بھائی کو دے رہا ہے جو سرمایہ نہ ہونے کے باعث کسی اور کے سرمائے پر کام کرنے پر مجبور ہے لیکن یہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سرمائے کی بنیاد پر اس کی محنت میں حصہ دار بنتا ہے......الخ''۔

یہاں ڈاکٹر اسرار صاحب نے دو غلطیاں کی ہیں۔

1- مضاربت کی تعریف جو کتب فقہ میں ملتی ہے وہ یوں ہے۔ عقد الشركة بمال من احد الجانبين والعمل من الجانب الآخر یعنی ایسا عقد شرکت جس میں ایک جانب سے سرمایہ اور دوسری جانب سے محنت ہو۔ لیکن اس میں ''زائد سرمایہ'' کی کوئی قید نہیں جو کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ''اور کسی

دوسرے شخص کے پاس زائد سرمایہ موجود ہے''۔ اب چونکہ یہ قید لگا چکے اس لئے یہ سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ کسی کے پاس سرمایہ تو ہو لیکن زائد نہیں تو اس کے بارے میں یہ ہدایت کی کہ ''وہ خود دکان لگائے محنت کرے اور رزق حلال کمائے''۔ اب اگر کوئی یہ سوال کر بیٹھے کہ اگر اس کے پاس اپنی معیشت کے بقدر سرمایہ ہے لیکن وہ دکانداری اور تجارت کے طریقوں سے ناواقف ہے یا مثلاً عورت ہے یا یہ کہ اس کی طبیعت اور ذہن اس میں نہیں چلتا یا مثلاً یہ کہ اس کے پاس وقت نہیں ہے مثلاً وہ طالب علم ہے یا عالم ہے یا بغیر معاوضہ کے تبلیغ کرنا چاہتا ہے یا کم تنخواہ پر ملازم ہے تو پھر کیا کرے؟ ڈاکٹر صاحب نے اس تیسری صورت کے لئے تو گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

اسی بات کو صاحب ہدایہ نے اس طرح ذکر کیا ہے: وهي مشروعة للحاجة اليها فان الناس بين غني بالمال غبي عن التصرف فيه و بين مهتد في التصرف صفر اليد عنه فمست الحاجة الى شرع هذا النوع من التصرف لينتظم مصلحة الغبي والذكي والفقير والغني۔ یہ حاجت کی بناء پر مشروع ہے کیونکہ لوگوں میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو مالدار ہوں لیکن مال میں تصرف سے غبی ہوں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو کام کے طریقے خوب جانتے ہیں لیکن خالی ہاتھ ہوتے ہیں۔ تو حاجت اس نوع کے تصرف کی مشروعیت کا باعث ہوئی تاکہ غبی اور ذکی اور فقیر اور غنی کی مصلحت کا انتظام ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیا یہ بھی کوئی شرط ہے کہ صاحب محنت کا اپنا سرے سے کوئی سرمایہ نہ ہو؟ حالانکہ یہ صورت بھی مضاربت کی ممکن ہے کہ محنت والے کا اپنا سرمایہ بھی اسی کام میں لگا ہو۔

ڈاکٹر صاحب کی دلیل میں غلطی

رہی یہ بات کہ ''یہ دین میں پسندیدہ نہیں'' تو دعویٰ بلا دلیل ہے کیونکہ ایسی کتنی ہی صورتیں ہیں جن میں ایک شخص دوسرے کی محنت کے بل بوتے پر خوب کماتا ہے۔ کاروباری اداروں میں اور دکانوں میں ملازمت، اسی طرح کارخانوں میں ملازمت۔

اگر "قل العفو" کے تحت مضاربت ناپسندیدہ ہے تو یہ سب صورتیں بھی ناپسندیدہ ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ضرورت سے زائد سرمایہ ان ملازمین کو دے دیا جائے تو یہ بھی اپنے طور پر کوئی کاروبار یا دھندا کر کے سرمایہ دار کو نفع میں شریک کرنے پر راضی نہ ہوتے۔

پھر ہدایہ اور اس کی شرح عنایہ میں ہے

(وبعث النبیﷺ) بیان ان ثبوتها بالسنة والاجماع فانه ﷺ بعث (والناس یباشرونه فقررهم) علیٰ ماروی ان العباس بن عبدالمطلب کان اذا دفع مضاربة شرط علی المضارب ان لا یسلك به بحرا وان لا ینزل به وادیا ولا یشتری به ذات کبد رطب فان فعل ذلك ضمن فبلغ رسول الله ﷺ فاستحسنه۔ وتقریر النبی ﷺ امرا یعاینه من اقسام السنة علی ماعلم (وتعاملت به الصحابة) من غیر نکیر فکان اجماعا۔

یہ بیان ہے کہ مضاربت سنت اور اجماع سے ثابت ہے کیونکہ نبی ﷺ مبعوث فرمائے گئے اس حال میں کہ لوگ اس کا ارتکاب کرتے تھے اور آپ نے ان کی تقریر فرمائی جیسا کہ روایت ہے کہ عباس بن عبدالمطلب جب مضاربت کے طور پر مال دیتے تھے تو مضارب پر شرط لگاتے تھے کہ وہ اس کو لے کر سمندری سفر پر نہ جائے کسی وادی میں نہ اترے اور اس سے کسی جاندار کو نہ خریدے اور اگر اس نے ایسا کیا تو ضامن ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آپ نے اس کو پسند فرمایا۔ اور نبی ﷺ کی تقریر ایسے امر پر جس کا آپ نے معائنہ کیا ہو سنت کی اقسام میں سے ہے جیسا کہ معلوم ہے اور صحابہ کا بغیر کسی انکار کے اس پر تعامل رہا ہے تو یہ اجماع ہوا اور ان صحابہ میں حضرت عمر، عثمان اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم ہیں۔

اب ایک کام جو نبی ﷺ کے سامنے بلکہ آپ کے چچا کرتے ہوں اور فقہاء صحابہ کرتے ہوں نبی ﷺ نے اس کے غیر پسندیدہ ہونے کی نہ کوئی تصریح کی ہو اور نہ ہی اس کا کوئی اشارہ دیا ہو۔ اور کسی طرف سے نکیر بھی نہ ہو، اس کے بارے میں یہ کہنا کہ دین میں ناپسندیدہ ہے دین میں ناجائز دخل اندازی ہے۔

باب:12

خراجی زمین کے مفہوم سے عدم واقفیت

ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں۔

"............ وہ یہ فقہ حنفی کی رو سے ہمارے بعض علماء کی نہایت ہی قابل غور اور فکر انگیز رائے یہ ہے کہ پاکستان کی اکثر و بیشتر قابل کاشت اراضی خراجی زمینیں ہیں عشری نہیں ہیں۔ خراجی زمین کا مطلب یہ ہے کہ جس ملک کو مسلمانوں نے فوجی قوت سے فتح کیا ہو وہاں کی زمینیں انفرادی ملکیت میں نہیں رہتیں بلکہ وہ حکومت کی اجتماعی ملکیت ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی وقت کوئی دوسری قوم ملک پر قابض ہو جائے لیکن جب مسلمان اسے دوبارہ حاصل کر لیں یا وہ ملک آزاد ہو جائے تو پھر بھی زمین کی حیثیت خراجی رہے گی۔ گویا جو زمینیں ایک مرتبہ خراجی ہو گئیں وہ ہمیشہ خراجی رہیں گی اس زمین کے مزارع ریاست کے مزارع ہوں گے اور یہ مزارعت موروثی چل سکتی ہے۔ کوئی زمیندار مالک بن کر ان پر قابض نہیں رہ سکتا۔ اب یہ مسئلہ بھی انتہائی غور اور حل طلب ہے اس پر غور و فکر ہونا اور اسلام کی منشاء کے مطابق ہمارے یہاں کے کاشتکاری کے موجودہ نظام کو استوار کرنا لازم و لا بدمنہ ہے جس کے بغیر یہاں نہ صحیح طور پر جمہوریت آسکتی ہے اور نہ ہی اسلامی نظام قائم و نافذ ہوسکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی برکات سے ہمارا ملک فیض یاب ہوسکتا ہے"۔

(میثاق اپریل 85ء ص 15-16)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کو نہ تو مفتوحہ اراضی کے مسئلہ کا

علم ہے اور نہ ہی خراجی زمین کے مفہوم سے وہ واقف ہیں۔

یہاں خراجی زمین کی جو تعریف ڈاکٹر اسرار صاحب نے بتائی ہے وہ درست نہیں ہے بلکہ صورت یوں ہے کہ فوجی قوت اور قہر وغلبہ کے ساتھ اگر ملک فتح ہو تو اس صورت میں ملک کی اراضی کے متعلق امام المسلمین کو تین قسم کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

(الف) یہ کہ منقولہ اموال غنیمت کی طرح اراضی کو بھی تقسیم کر دے یعنی پانچواں حصہ بیت المال کے لئے نکال کر باقی چار حصے غانمین جنہوں نے یہ ملک فتح کیا ہے ان میں تقسیم کر دے۔ پانچواں حصہ اراضی بیت المال میں شامل ہو جائے گا اور جو اراضی غانمین میں تقسیم ہو گی ان میں ہر شخص اپنے اپنے حصے کا مالک ہو گا۔ اس کو ہر قسم کے مالکانہ تصرفات بیع و ہبہ و وقف وغیرہ کے مکمل اختیارات ہوں گے اور اس کے انتقال کے بعد یہ زمین ان کے وارثوں میں حسب حصص شرعیہ منتقل ہو گی۔ ان زمینوں پر عشر ہو گا اور یہ عشری زمین کہلاتی ہیں۔

(ب) اراضی مفتوحہ میں سے جو زمینیں لوگوں کی املاک ہیں ان پر ان ہی لوگوں کی ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی زمینوں پر خراج اور ان پر جزیہ مقرر کر دے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق اور شام اور مصر کی عام اراضی مملوکہ کے ساتھ یہی دستور العمل اختیار فرمایا۔ اس صورت میں اراضی مملوکہ قدیم باشندگان ملک کی ملک میں بدستور قائم رہیں گی۔ نہ غانمین کو ان میں تصرف کا کوئی حق ہو گا نہ بیت المال کا حصہ خمس ان میں سے لیا جائے گا۔ صرف ان زمینوں کا خراج بیت المال کا حق ہو گا۔ یہ زمینیں خراجی کہلاتی ہیں۔

(ج) یہ کہ ان اراضی کو نہ غانمین میں تقسیم کرے اور نہ مالکان سابق کی ملک ان پر قائم رکھے بلکہ ان کو سابقہ مالکان کی ملکیت سے نکال کر ان کی زمینوں کو اراضی بیت المال میں شامل کر دے اور پھر بیت المال کی طرف سے ان کی زراعت وآبادی کا انتظام ہو۔ یہ وقف زمین کہلاتی ہیں۔

بعض فقہاء کی تحقیق مصر وشام وعراق کی زمینوں کے متعلق بھی ہے یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان میں یہی تیسری قسم کا اختیار نافذ فرمایا تھا اور اسی لئے ان فقہاء کے نزدیک عراق وشام وغیرہ کی اراضی وقف ہیں اور ان کی بیع وشراء جائز نہیں۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کی لاعلمی دیکھئے کہ وہ اراضی کے خراجی ہونے کا بڑے شد و مد سے بیان دیتے ہیں جب کہ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ خراجی زمین تو مملوکہ زمین ہوتی ہے جس کے مالک کو زمین کا ٹیکس جس کو خراج کہتے ہیں دینا پڑتا ہے۔ اگر زمین مملوکہ نہ ہو وقف ہو تو وہ اراضی بیت المال یا اراضئ وقف کہلاتی ہیں۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے جن بعض علماء کی رائے نقل کی ہے انہوں نے بھی اراضی کو خراجی نہیں کہا بلکہ اراضی بیت المال کہا ہے۔ مولانا محمد علی تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ میں ذکر کیا ہے کہ اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی بلکہ اراضی حوزہ ہیں یعنی حکومت کے بیت المال کی ملکیت ہیں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہیں۔ (اسلام کا اقتصادی نظام ص 401)

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اور حضرت شیخ جلال تھانیسری رحمہ اللہ نے ایک رسالہ اراضی ہند کے احکام کے بارہ میں لکھا اور اس رسالہ میں انہوں نے اس مذہب کو (کہ ہندوستان کی زمین زمینداروں کی ملک ہے) بہت سے دلائل وشواہد سے باطل قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی اراضی آج بھی ...... عامۂ مسلمین کے لئے وقف ہیں یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں کسی شخص وفرد کی ملکیت نہیں اور نہ زمینداروں کی ملکیت اور نہ زمینداروں کو چودھری اور نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل ہے'' (اسلام کا اقتصادی نظام: ص402)

باب: 13

ڈاکٹر اسرار صاحب کا نیم تقلیدی فلسفہ

ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں:

''تقلید جامد اور اجتہاد مطلق کے درمیان ہمیں ایک معتدل راستہ اختیار کرنا ہوگا، تقلید جامد سے میری مراد کیا ہے؟ یہ کہ بس ایک فقہ کو اس طرح پکڑ کر بیٹھے ہیں کہ اس سے ذرا بھی ادھر یا ادھر نہ خود ہوں گے نہ برداشت کریں گے۔ انسان اس معاملہ میں اتنا زودحس اور الرجک ہو جائے کہ کسی دوسرے فقہ کی کوئی بات سامنے آئے تو وہ یہ سمجھے کہ میں کوئی اور ہوں اور یہ کوئی اور ہے۔ یہ در حقیقت وحدت امت کے لئے سخت نقصان دہ ہے، رہا عوام کا معاملہ تو ان کے بارے میں، میں کہوں گا کہ اتباع رسول علیہ الصلوۃ والسلام کی نیت سے کسی ایک فقہ کو مستقلاً اختیار کر لیں تو مطلقاً کوئی حرج نہیں ...... البتہ ان پر یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ اہل سنت کے تمام مسالک مبنی بر کتاب وسنت ہیں۔ تا کہ دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے متعلق ان کے دلوں میں غیریت کا احساس بالکل پیدا نہ ہو۔ رہا ان حضرات کا معاملہ جو دین کے خادم ہیں جو میدان میں آ کر دین کی خدمت کر رہے ہیں جن کے سامنے اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور احیائے دین کی منزل ہے انہیں تو یقیناً اس تقلید جامد سے نکلنا پڑے گا''۔
(ص:367/368)

''......جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہی ہدایت میں نے تنظیم اسلامی

کے رفقاء کو دی ہے۔ فقہی مسائل کے بارے میں، میں اپنی رائے کے اظہار سے بھی حتی الامکان گریز کرتا ہوں البتہ میرا ایک مزاج ہے میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میں مقلد محض نہیں ہوں۔ میں نیم مقلد ہوں۔ میں ان پانچوں ائمہ کا مقلد ہوں۔ ان پانچوں دائروں سے باہر جانے کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری مشترک متاع ہے۔ ان دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔ میرے مزاج میری افتاد طبع اور میری احتیاط کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ آپ کے اس شہر لاہور ہی کی نہیں بلکہ عالم اسلام کی مشہور علمی درسگاہ اور دارالعلوم کی ایک جید شخصیت عالم دین شیخ الحدیث کی خدمت میں آج سے قریباً ڈھائی سال قبل میں نے حاضر ہو کر اپنی تمام کتابیں ان کے قدموں میں ڈال دیں اور ان سے عرض کیا کہ اگر ان میں سے آپ کسی ایسی بات کی نشان دہی فرما دیں جو ائمہ اربعہ اور امام بخاری رحمہم اللہ کے دائرے سے باہر کی ہے تو میں ان کو اپنی کتابوں سے حذف کر دوں گا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف حنفیت میں منحصر ہے تو میرا راستہ اور ہے اور آپ کا اور۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ جب کہ ہم ان سب کو اہل سنت کے ائمہ تسلیم کرتے ہیں تو میں نے عرض کیا کہ میں ان شاء اللہ ان تمام باتوں سے رجوع کر لوں گا جو امت کے مسلمہ ان پانچ ائمہ عظام کے دائرے سے باہر کی ہوگی۔ (ص 371)

1- ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے ''ان (پانچوں) دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو بھی اقرب الی السنۃ اور اقرب الی الصواب سمجھتا ہوں اس کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں''۔

لیجئے چیونٹی کو بھی پر لگ گئے۔ کہاں تو وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ''میں یہ بات کئی بار عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ میں عالم دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں ہوں مجتہد ہونا تو بہت دور کی بات ہے فقہ کے متعلق میرا مطالعہ محدود ہے'' (میثاق:

84ء ص 44)

یعنی نہ عالم ہیں نہ فن حدیث پر کچھ عبور ہے، نہ علم فقہ اور اصول فقہ سے کچھ ممارست ہے لیکن اب سبحان اللہ ایسے پر لگ گئے ہیں کہ مجتہدین کے اقوال اور ان کے دلائل کو پرکھ سکتے ہیں اور ان کے درمیان فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس کی بات درست ہے اور سنت کے زیادہ قریب ہے۔

2- الحمد للہ مسلمانوں میں چاروں فقہوں کا احترام موجود ہے اور مسلمان سب کو اہلسنت میں سے شمار کرتے ہیں اور بعض مسائل کے اختلاف کے باوجود ان میں یہ تصور سرے سے نہیں ہے کہ میں کوئی اور ہوں اور یہ کوئی اور ہے۔

ہاں ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا ہے جو اپنے آپ کو اہلحدیث کہلواتا ہے اور تقلید کو شرک کہتا ہے۔ اس طبقہ کی وجہ سے امت کے اندر انتشار پھیلا ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب بھی چونکہ بوجوہ کسی ایک مجتہد کی تقلید کے پابند نہیں رہنا چاہتے اس لئے ان کو اس طبقہ کے ساتھ ایک مناسبت اور ہمدردی ہے اس لئے لکھتے ہیں:

''البتہ چونکہ مسالک اربعہ کے پیروؤں میں سے تو ہمارے یہاں شاید احناف کے سوا شاذ ہی کسی اور مسلک کے لوگ موجود ہوں لیکن اہلسنت کا ایک اور گروہ برصغیر پاک و ہند میں معتد بہ تعداد میں موجود ہے جو غیر مقلد یا اہلحدیث یا سلفی المسلک الغرض مختلف ناموں سے موسوم ہے...... اور اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ صرف ایک مسلک ہے کوئی معین مذہب نہیں اور اصولی طور پر اس میں کسی معین مجتہد کی تقلید خارج از بحث ہے تاہم اکثر و بیشتر مسائل میں یہ حضرات امام بخاریؒ کے اجتہادات ہی کا اتباع کرتے ہیں چنانچہ کچھ حضرات انہیں طنزاً مقلدین بخاریؒ کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔......

اور جیسا کہ میں نے اپنی زیر بحث تقریر میں عرض کیا تھا امام بخاریؒ وہ شخصیت ہیں جن کے مرتب کردہ مجموعہ احادیث کو جملہ اہلسنت اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کرتے ہیں۔ مزید براں اکابر علمائے احناف نے ان کی فقاہت

کو خراج تحسین ادا کیا ہے لہٰذا میں نے اپنی ذات کی حد تک نیم تقلید کا جو دائرہ بنایا ہے اس میں ائمہ اربعہ کے ساتھ ساتھ امام بخاریؒ کو بھی شامل کیا ہے۔''

(میثاق 84ء 29,30)

نیم تقلید کی وجوہ

1- ڈاکٹر صاحب اپنے مزاج کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ لکھتے ہیں ''میرا ایک مزاج ہے۔ میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میں مقلد محض نہیں ہوں۔ میں نیم مقلد ہوں''۔ (ص 271 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

2- دعوت الی اللہ کے کام کرنے والے میں کوئی فقہی لیبل چسپاں نہ ہونا چاہئے۔ لکھتے ہیں۔

''دعوت اللہ کی طرف ہو۔ اس کے ساتھ ہی داعی کی سیرت و کردار عمل صالح کا مظہر ہو۔ مزید براں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے مسلمان کہلائے۔ کسی فقہی مسلک کی طرف نہ دعوت ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چسپاں ہو''۔ (میثاق اگست 84: ص 27)

ان دو وجہوں میں سے پہلی وجہ تو بے وزن ہے کیونکہ محض کسی کا خاص مزاج ہونا کوئی دلیل نہیں ہے۔ مزاج کو شریعت کے تابع کیا جاتا ہے شریعت کو مزاج کے تابع نہیں کیا جاتا۔ رہی دوسری وجہ تو یہ پہلی سے بھی زیادہ بے وزن ہے۔ امام غزالی پر شافعی ہونے، ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب پر حنبلی ہونے، شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید اور مولانا الیاس پر حنفی ہونے کا لیبل چسپاں تھا لیکن اس سے ان کے کام اور ان کی دعوت کو کچھ بھی نقصان نہیں ہوا۔

غرض ڈاکٹر اسرار صاحب کا نیم تقلیدی فلسفہ اپنی بنیاد اور آثار دونوں کے لحاظ سے بے وزن تو ہے ہی خطرناک بھی ہے۔ اسی سے ڈاکٹر صاحب کے وہ افکار و نظریات پھوٹے ہیں جن کا ذکر ہم نے اس کتاب میں کیا ہے۔

باب:14

ڈاکٹر اسرار صاحب کے منابع فہم قرآن

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اور الحمد للہ کہ ان دروس و خطابات کے ذریعے قرآن کے جس فہم و فکر کی اشاعت ہو رہی ہے وہ کسی ایک لکیر کے فقیر یا کنویں کے مینڈک کی مانند نہیں ہے بلکہ اس میں کم از کم چار منبعوں سے پھوٹنے والے سوتوں کا قران السعداء موجود ہے یعنی:

ایک: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا رسوخ فی العلم۔

دوسرے: ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی جدید فلسفہ و سائنس اور جدید سیاست و اقتصادیات کے ضمن میں تنقیدی بصیرت۔

تیسرے: مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم کا جذبہ حرکت و عمل اور تصور جہاد فی سبیل اللہ۔

چوتھے: مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کا تعمق و تدبر قرآن کا اسلوب و منہاج۔ (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص 24)

ڈاکٹر اسرار صاحب کی فکر دیکھئے۔ اگر کوئی شخص صرف مولانا محمود حسن اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی تفسیر تک محدود رہے تو وہ اس کو لکیر کا فقیر اور کنویں کا مینڈک سمجھتے ہیں۔ اب ان کے فہم قرآن کے دیگر منابع پر بھی نظر ڈال لیجئے:

ڈاکٹر اسرار صاحب نے تصور دین اور تصور عبادت مودودی صاحب

ہی سے اخذ کئے ہیں اور ان تصورات کے غلط ہونے کو ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے جو نیم تقلیدی فلسفہ ایجاد کیا ہے اس کی اصل فکر بھی انہوں نے مودودی صاحب سے ہی حاصل کی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے افکار

1- ڈاکٹر اسرار صاحب نے نظریہ ارتقاء اور اس کے دلائل کو ڈاکٹر رفیع الدین صاحب سے حاصل کیا ہے جس کو انہوں نے تفصیل سے اپنی کتاب ''قرآن اور علم جدید'' میں لکھا ہے۔ قرآن و حدیث سے اس کا بطلان ہم ثابت کر چکے ہیں۔

2- تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ۔ (سورہ معارج)

چڑھیں گے اس کی طرف (یعنی پیشی کے لئے حاضر ہوں گے) فرشتے اور لوگوں کی روحیں (قیامت کے) اس دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب اس آیت کا کچھ اور ہی مطلب بتاتے ہیں کہتے ہیں کہ

''یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کا ارتقاء قوانین قدرت کا ارتقاء ہے۔ یہاں ان قوانین قدرت کو ملائکہ کہا گیا ہے کیونکہ ان کے عمل پر ملائکہ مامور ہیں۔ جب زندگی بلند سطحوں کی طرف ارتقاء کرتی ہے تو وہ نئے قوانین کے عمل کی زد میں آ جاتی ہے اور پھر نئے بلند سطحوں کے ملائکہ اس پر مامور ہوتے ہیں۔ یہی فرشتوں کا عروج الی الحق ہے۔ اور یہاں روح سے مراد زندگی ہے جو جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں موجود ہے اور رفتہ رفتہ ارتقائی مدارج طے کر کے آگے بڑھ رہی ہے۔ یہی زندگی کا عروج الی الحق ہے۔

اس لئے ڈاکٹر رفیع الدین اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

اور اس کی طرف وہ قوتیں جو قوانین قدرت کے عمل کو حرکت میں لانے کے لئے مامور ہیں اور زندگی، یہ دونوں چیزیں ارتقاء کرتی ہیں ایسے ایک دور میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوتی ہے۔ (قرآن اور علم جدید)

3- وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا۔ (سورہ اعراف: 172)

اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب بولے ہاں کیوں نہیں۔ (سورہ اعراف 172)

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب لکھتے ہیں۔

''ظاہر ہے کہ ایسا وعدہ جو خدا نے ہمیں بھلا دیا ہے ہمارے لئے باعث حجت نہیں ہوسکتا لیکن ہماری فطرت کے اندر خدا کی عبادت کی خواہش کا موجود ہونا خدا کی ربوبیت کا ایک ایسا اقرار ہے جو انکار میں بدل نہیں سکتا۔

یہ آیت کسی واقعہ کو بیان نہیں کرتی بلکہ ایک واقعہ کی شکل میں فطرت انسانی کے ابدی اور ازلی حقائق کو بیان کرتی ہے''۔ (قرآن اور علم جدید)

جس واقعہ کا ہونا حدیث سے ثابت ہے اور قرآن کا ظاہر الفاظ بھی جس کا متقاضی ہے اور پوری امت جس پر متفق رہی ہے ڈاکٹر رفیع الدین صاحب اس واقعہ کا ہی انکار کررہے ہیں حالانکہ اگر ہم بھول گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب سے اور اپنے رسولوں کی وساطت سے ہمیں وہ واقعہ یاد دلایا ہے اور انسانی فطرت کے اندر خدا کی عبادت کی خواہش اس واقعہ کے وقوع پر ایک بڑا قرینہ ہے۔

4- حضرت آدم علیہ السلام اور فرشتوں کے قصہ کے وقوع کا انکار کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیع الدین صاحب لکھتے ہیں:

''خدا کو اس بات کی حاجت نہیں کہ وہ فرشتوں سے اپنے عزائم اور مقاصد کے بارے میں کوئی گفتگو یا مشورہ کرے اور نہ فرشتوں کا یہ مقام ہے کہ وہ خدا پر دبی زبان سے بھی اعتراضات کریں اور پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ فرشتوں کو اپنے اعتراضات میں برسر غلط ثابت کرنے کے لئے ایک ایسے علم میں آدم کے ساتھ ان کے مقابلہ کا امتحان منعقد کرے جو فریقین کو اسی کی طرف سے عطا کیا گیا ہو...... نہ فرشتوں کا سجدہ کرنا زمین پر سر ٹیکنے کے

مترادف ہے اور نہ ابلیس کا انکار سر ٹیکنے سے انکار ہے۔ پھر جنت عالم حقیقی کی چیز ہے عالم مادی کی نہیں''۔ (قرآن اور علم جدید)

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ تو ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے اپنی کتاب قرآن اور علم جدید میں اہلسنت کے بہت سے عقائد کو ترک کر کے فلسفیوں کے سے تصورات کو اختیار کیا ہے۔

امین احسن اصلاحی صاحب کا تدبر قران

ڈاکٹر اسرار صاحب کے فہم قرآن کا ایک منبع امین احسن اصلاحی صاحب کا تدبر قرآن کا اسلوب ومنہاج ہے۔ اس اسلوب ومنہاج کو اصلاحی صاحب کی اپنی تحریر میں پڑھئے اور ہوا کا رخ دیکھئے۔

اسلاف کا طریقہ تفسیر نقل کرنے کے بعد اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

تفسیر کا یہ طریقہ بالکل فطری ہے۔ اصلی چیز خود قرآن مجید کے الفاظ اور اس کی اپنی توضیحات ہیں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ کی سنت ہے اور تیسرا درجہ اقوال صحابہ کا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جو لوگ آنحضرت ﷺ کی تشریحات اور صحابہ کے اقوال کی روشنی میں قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں اس میں تفسیر کے لئے اصل الاصول خود قرآن مجید کے الفاظ اور اس کی توضیحات ہی کو قرار دیا گیا ہے کہ اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا۔ ہاں اگر کوئی بات ایسی ہے جو خود قرآن مجید سے صاف نہیں ہو رہی تو اس کے لئے آدمی کہاں جائے؟ ایک آزاد خیال سے آزاد خیال آدمی بھی اس سوال کا جواب یہی دے گا کہ ایسی مشکلات میں بہترین رہنمائی سنت رسول اور اقوال صحابہ کی رہنمائی ہی سے ہوسکتی ہے......'' یہاں تک تو اصلاحی صاحب اسلاف کے طریقے پر رہے ہیں لیکن اس کے بعد اچانک رخ موڑ دیتے ہیں اور دو طریقوں سے تفسیر میں حدیث وسنت کی اہمیت بھی گھٹا دیتے ہیں۔

حدیث کی تنقیص کا پہلا طریقہ

''(رہنمائی کی صورت) یہ ہوگی کہ ایک آیت پر اس کے الفاظ کی روشنی میں پوری طرح غور کیا۔ قرآن مجید میں جو آیات اس کی مماثل ہیں ان کی روشنی

میں بھی اس کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ سیاق وسباق اور عمود ونظم کے پہلو سے بھی اس پر نگاہ ڈال لی لیکن ان تمام باتوں کے بعد بھی پوری تشفی نہیں ہوتی۔ الفاظ کچھ چاہتے ہیں لیکن صاف نہیں معلوم ہوتا کیا چاہتے ہیں؟ اب ہم احادیث اور اقوال صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کوئی ایسی بات پا لیتے ہیں جس سے اس آیت کا تمام عالم روشن ہو جاتا ہے۔ الفاظ کو اس کے بعد کسی بات کا انکار نہیں رہ جاتا۔ نظم اور سیاق کلام سب کا حق ادا ہو جاتا ہے تو اس بات کو اگر وہ صحیح طریقہ سے منقول ہوگی قبول کر لیں گے۔ (مبادی تدبر قرآن 147-145)

یہاں اسلاف کے طریقہ تفسیر اور اصلاحی صاحب کے طریقہ تفسیر میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اسلاف تو حدیث کو اس کے مرتبہ میں قرآن کا شارح اور مفسر سمجھتے ہیں اور جہاں قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ہو سکتی ہو حدیث سے ہوتی ہو وہاں حدیث ہی کو مفسر قرار دیتے ہیں لیکن اصلاحی صاحب حدیث کو قرآن کا شارح اور مفسر نہیں مانتے بلکہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جہاں قرآن کی تفسیر فقط قرآن سے کرنے میں کامیابی نہ ہو وہاں وہ قرآن کی تفسیر کرنے میں حدیث سے مدد تو لیں گے لیکن پھر بھی حدیث کو مفسر اور شارح کے طور پر نہیں لیں گے، اور یہ مدد بھی اس لئے نہیں کہ حدیث کو تفسیر میں دخل ہے بلکہ محض اس لئے کہ اپنے غور وفکر سے وہ جس نتیجہ تک پہنچے ہیں اور اس کے بارے میں کچھ کھٹک ہے تو وہ کھٹک دور ہو جائے اور اطمینان ہو جائے کہ ان کا غور وفکر صحیح ہے اور صحیح نتیجہ دے رہا ہے۔ اس لئے وہ جس حدیث سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس کا احسان نہیں مانتے اور اس کو تفسیر کے طور پر ذکر نہیں کرتے۔

اصلاحی صاحب ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ خود لکھتے ہیں۔

''اگر ان روایات کی تحقیق وتنقید کر کے ان کے اندر جو مغز ہے اس کو الگ بھی کیا جا سکے جب بھی تنہا انہی کو تفسیر میں فیصلہ کن چیز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ روایات صحت کے معیار پر پوری اترنے کے بعد بھی ظن کے شائبہ سے پاک نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اگر قرآن مجید کی تفسیر میں تنہا

انہی کو فیصلہ کن چیز مان لیا جائے تو قرآن مجید کی قطعیت کو نقصان پہنچے گا اور یہ چیز کسی طرح بھی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے شواہد و دلائل کے ساتھ مل کر تو بلاشبہ یہ روایات قرآن مجید کے صحیح مفہوم کی تعیین میں بہت زیادہ مددگار ہو سکتی ہیں لیکن تنہا انہی کی مدد سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا''۔

اصلاحی صاحب نے جس طرح سے کھل کر یہاں حدیث کی تنقیص کی ہے اس کی مزید تفصیل ان کی کتاب مبادی تدبر حدیث میں موجود ہے۔ کیا ہی عجیب بات ہے کہ ان کے غور وفکر کو تو قطعیت حاصل ہو اور حدیث صحیح ہونے کے باوجود بھی تفسیر میں اس وجہ سے قابل اعتبار نہ ٹھہرے کہ وہ ظن کے شائبہ سے پاک نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اصلاحی صاحب نے نہ تو قطعیت کے معنی کو سمجھا ہے اور نہ ہی حدیث میں ظنیت کے معنی سے انصاف کیا ہے۔ اس کے بارے میں ہم نے تفصیل سے اپنی کتاب ''تحفہ اصلاحی'' میں لکھا ہے۔

حدیث کی تنقیص کا دوسرا طریقہ

''صحیح راہ یہی ہے کہ آدمی ......صرف قرآن کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنائے۔ اس کی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر تدبر کرے۔ ٹھیک مفہوم متعین کرے۔ طبیعت میں جو سوال پیدا ہو اس پر بار بار غور کرے جو بات سمجھ میں آئے اس کے نظائر وشواہد تلاش کرے۔ سیاق وسباق سے اس کی مطابقت معلوم کرے، نظم کے اعتبار سے اس کا موقع ومحل دیکھے۔ عمود کلام کے پہلو سے اس کی مناسبت کو جانچے پھر اس پر خود اپنی طرف سے شکوک وشبہات وارد کرے اور جب دیکھ لے کہ اس نے جو بات سمجھی ہے بالکل پکی ہے اس میں کسی پہلو سے کوئی خامی نہیں ہے تب تفسیروں میں اس کو دیکھے اور ہمیشہ صحیح روایات پر نگاہ رکھے۔ ضعیف اور کمزور روایات کو جن سے کتب تفسیر بھری ہوئی ہیں کبھی ہاتھ نہ لگائے۔ ان شاء اللہ صحیح روایات سے اس کی تائید ہوگی اور اپنے دل میں ایک ایسی خوشی کا جوش محسوس کرے گا جس میں اطمینان، بلندی اعتماد اور عشق ومحبت

قرآن کی نہیں معلوم کتنی کیفیتیں ملی ہوئی ہوں گی۔

لیکن فرض کیجئے یہ سارے جتن کرنے کے بعد آپ کسی آیت کے بارے میں ایک نتیجہ تک پہنچے اور جب تفسیر کی کتابوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ صحیح حدیثیں اور سلف کے اقوال آپ کے اختیار کردہ مطلب کے خلاف ہیں اور کوئی ادنی تائید بھی آپ کے ساتھ نہیں ہے تو اس وقت کیا کریں گے؟ کیا روایات اور اقوال سلف کو چھوڑ کر اپنی بات پر جم جائیں گے؟ نہیں! طالب صادق کی راہ یہ نہیں ہے بلکہ آپ ان احادیث اور اقوال کی روشنی میں اپنی تاویل پر دوبارہ غور کریں گے۔ اس صورت میں گمان غالب تو یہی ہے کہ اگر آپ غلطی پر ہوں گے تو آپ کی غلطی خود واضح ہو جائے گی۔ لیکن فرض کیجئے آپ نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا مگر آپ کو اپنی ہی تاویل صحیح معلوم ہوتی ہے اب کیا کریں گے؟ اب خود حدیث پر غور کریں گے۔ اس کو ہر پہلو سے پرکھیں گے۔ ہر کسوٹی پر جانچیں گے۔ انشاء اللہ یہ چیز مفید ثابت ہو گی۔ یا تو آپ کی تاویل کا ضعف واضح ہو جائے گا یا حدیث کی اصل حقیقت واضح ہو جائے گی لیکن طالب کے لئے یہ مرحلے نہایت سخت ہیں اور ان میں صبر و ثبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ عجلت اور تیز گامی اس منزل میں معصیت ہے۔ اس طرح کے مواقع پر عرصہ تک توقف کرنا چاہئے اور پھر سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے۔ جب قلب پوری طرح سے ایک بات کے لئے کھل جائے کسی طرح کی بھی کوئی خلش باقی نہ رہ جائے تو اس بات کو اختیار کر لینا چاہئے اور پھر اس امر کی ذرا بھی پروا نہیں کرنی چاہئے کہ کوئی چیز اس کے خلاف ہے۔'' (مبادی تدبر قرآن 55-54)

یہاں بھی اصلاحی صاحب اپنے غور و فکر کو صحیح حدیث پر ترجیح دے رہے ہیں اگرچہ اس صحیح حدیث پر دوبارہ نئے سرے سے غور بھی کر لیا ہو اور ہر پہلو سے اس کو چھان پھٹک بھی لیا ہو۔ کیا یہی وہ تدبر قرآن کا اسلوب ہے جس پر ڈاکٹر اسرار صاحب فخر کر رہے ہیں۔ (ختم شد)

اضافہ جات

ایک استفتاء اور اس کا جواب

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ایک ایسے شخص کے بارے میں جس کا موقف یہ ہے کہ:

1- انسان دو چیزوں کا مرکب ہے۔ ایک اس کا روحانی وجود ہے اور ایک حیوانی وجود! (آدمی زادہ طرفہ معجون است۔ از فرشتہ سرشتہ و زحیوان)...... روحانی وجود کا تعلق عالم امر سے ہے اور وہی انسان کے عز و شرف کی اصل بنیاد ہے، الفاظ قرآنی "فَاِذَا سَوَّ يْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ" میں اسی روحانی وجود طرف اشارہ ہے جب کہ حیوانی وجود ارتقاء کے مختلف مدارج طے کرتا ہوا کروڑوں اور اربوں سالوں میں اس شکل تک پہنچا ہے جسے انسان کہا جاتا ہے۔ عالم امر کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں ہر کام چشم زدن میں ہو جاتا ہے "اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" جبکہ عالم خلق میں ہر شے کو اپنے نقطہ کمال تک پہنچنے میں وقت درکار ہوتا ہے، جیسا کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بارے میں قرآن حکیم میں صراحت موجود ہے کہ اللہ نے چھ دنوں میں تخلیق فرمایا اور یہ کہ اللہ کا ایک دن انسانی تقویم کے اعتبار سے ایک ہزار برس کے مساوی ہے "وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ"

2- وہ شخص ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو صریح گمراہی قرار دیتا ہے لیکن نفس ارتقاء کا قائل ہے۔ چنانچہ صاحب "قصص القرآن" مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی مانند وہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ اس معاملہ میں علم (ارتقاء) اور مذہب کے مابین کوئی تضاد نہیں ہے۔ (حوالہ قصص القرآن جلد اول ص 15) اس شخص کا کہنا ہے کہ انسان کے حیوانی وجود یعنی جسد انسانی کی تخلیق کی ابتداء مٹی اور پانی کے امتزاج سے

ہوئی جیسا کہ سورۃ السجدہ میں فرمایا گیا "وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ......" لیکن جسد انسانی کو موجودہ صورت تک ہزار ہا برس لگے اور اس نے ارتقاء کے مختلف مراحل طے کئے۔ تخلیق کا یہ تمام عمل اللہ ہی کے حکم سے اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ہوا۔ یہاں تک کہ جب انسان کا حیوانی وجود ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا آج سے قریباً دس ہزار برس قبل موجودہ صورت تک پہنچا تو اللہ نے اس میں وہ روح ملکوتی پھونکی جس کا تعلق عالم امر سے ہے اور جسے اللہ نے خود اپنی طرف نسبت دی ہے "وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ"۔ اسی فرد کا نام حضرت آدمؑ ہے جو روئے ارضی پر پہلے انسان تھے۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ سورۃ الاعراف کی آیت: 11 "وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ" اور سورۃ نوح کی آیت 17 "وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا" سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

3- وہ شخص اسلاف کی تشریحات کے مطابق درس قرآن بھی دیتا ہے اور اس کے درس کی اثر پذیری بھی نمایاں طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ وہ اس بات کا شدت کے ساتھ قائل ہے کہ اسلامی قانون و شریعت میں قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ حدیث و سنت رسولؐ کو بھی مستقل اساس کی حیثیت حاصل ہے، بلکہ اس کا کہنا ہے کہ احکام دین کی تفصیلات کے ضمن میں اکثر معاملات میں ہمیں تمام تر رہنمائی سنت رسولؐ ہی سے حاصل ہوتی ہے، چنانچہ اپنے دروس قرآن میں وہ حدیث و سنت کی اہمیت کو خصوصی طور پر اجاگر کرتا ہے، تاہم جسدِ آدمؑ کی تخلیق کے ضمن میں جو تفاصیل بعض احادیث میں وارد ہوئی ہیں ان کے بارے میں اس شخص کا کہنا ہے کہ جسد آدمؑ کی تخلیق کا معاملہ فی الاصل دنیاوی اور سائنسی امور میں سے ہے، چنانچہ اس معاملے میں نبی اکرم ﷺ کا بتایا ہوا وہ اصول کہ "انتم اعلم بامور دنیا کم" معتبر شمار ہوگا، اور ایسے معاملات میں تجرباتی اور سائنسی علوم کے ذریعے سے

جو حقائق ہمارے سامنے آئیں گے ان کی رعایت کی جائے گی، اور حدیث کے الفاظ کو علامتی اور استعاراتی نوعیت کے الفاظ پر محمول کیا جائے گا۔

اس شخص کا کہنا ہے کہ جسد آدم کی تخلیق کے ضمن میں قرآن حکیم میں سوائے اس ایک صراحت کے کہ انسان کو مٹی یا گارے سے پیدا کیا گیا اور کوئی تصریح نہیں ملتی، ہاں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے ''ارتقاء'' کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں حیات مادی کے بارے میں یہ اصول بھی ملتا ہے کہ مبدأ حیات پانی ہے۔ "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ"۔

4- اس شخص کا موقف ہے کہ اگر کوئی شخص تخلیق آدمؑ کے ضمن میں یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ نے مٹی کا ایک پتلا بنا کر اس میں روح پھونکی اور اس طرح آدم کی تخلیق ہوئی تو یہ بھی عین ایمان ہے اور اگر وہ یہ عقیدہ رکھے کہ جسد آدمؑ کی تخلیق کی ابتداء مٹی اور پانی کے امتزاج سے ہوئی اور وہیں سے حیات کا آغاز ہوا، پھر اللہ نے اسے ارتقاء کے مختلف مراحل سے گزارا، یہاں تک کہ جب وہ مکمل ہیولی تیار ہو گیا جس میں اللہ نے اپنی روح میں سے پھونکا تو اس جسد حیوانی اور روح ملکوتی کے امتزاج سے انسان وجود میں آیا جو اشرف المخلوقات قرار پایا اور مسجود ملائک ٹھہرا، تو اس عقیدے سے بھی ایمان میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

☆ کیا ایسے شخص کے عقائد کو ''اہل سنۃ والجماعۃ'' سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے؟

☆ کیا اس طرح کا عقیدہ رکھنے والا حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ گستاخی کا مرتکب قرار پائے گا؟

☆ کیا احادیث کے بارے میں اس شخص کے موقف کو گمراہی قرار دیا جائے گا؟

فقط والسلام

فرقان دانش خان

ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی

جناب فرقان دانش خان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

فتوے کے اسلوب سے کچھ ہٹ کر جناب کی خدمت میں عرض ہے کہ ماشاء اللہ آپ کے نام کے اجزاء یعنی فرقان اور دانش تقاضا کرتے ہیں کہ عقل و دانش سے کام لے کر حق و باطل کے درمیان فرقان کے نتیجہ تک پہنچنے میں کوتاہی اور بخل سے کام نہ لیا جائے۔

یہ استفتاء چونکہ قرآن اکیڈمی سے بھیجا گیا ہے اور جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان سے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ جس شخص کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے وہ جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہیں۔ اگرچہ قرآن اور نظریہ ارتقاء کے عنوان پر ڈاکٹر اسرار صاحب کی ٹیپ بھی موجود ہے لیکن میں نے اس عنوان سے ان کی تقریر آج سے تقریباً تیس سال پہلے بھی سنی تھی۔ اس وقت ہم ایم بی بی ایس کے طالب علم ہونے کے ناطے اور کچھ ڈاکٹر صاحب کے زور بیان سے متاثر ہونے کی وجہ سے ان کے نیاز مند تھے اور اسی نیاز مندی میں کچھ سائنسی (حیاتیاتی) اور کچھ قرآنی شواہد کی بناء پر نظریۂ ارتقاء کے غلط ہونے کے بارے میں ایک تحریر لکھ کر دی تھی۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کے منابع فہم قرآن میں سے ایک ڈاکٹر رفیع الدین صاحب بھی تھے۔ خود ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں:

> ''اور الحمد للہ کہ ان دروس و خطبات کے ذریعے قرآن کے جس فہم و فکر کی اشاعت ہو رہی ہے وہ کسی ایک لکیر کے فقیر کے کنویں کے مینڈک کی مانند نہیں ہے بلکہ اس میں کم از کم چار منبعوں سے پھوٹنے والے سوتوں کا قرآن السعداء موجود ہے یعنی ....
>
> دوسرے: ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی جدید فلسفہ و سائنس اور جدید سیاسیات و اقتصادیات کے ضمن میں تنقیدی بصیرت......
>
> (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص 24)

ڈاکٹر اسرار صاحب نے ہماری نیاز مندی کے جواب میں اپنی کمال بے نیازی سے فرمایا کہ تمہارا سائنسی اشکالات تو بے بنیاد ہیں (لہٰذا وہ تو ان کی کمال بے نیازی کے آگے فوراً ڈھیر ہو گئے) اور قرآنی شواہد کے بارے میں فرمایا کہ میں ان پر غور کروں گا۔ وہ دن اور آج کا دن ہمیں آج تک اس کا جواب نہیں ملا۔ آج سے تقریباً بارہ سال پہلے ہماری کتاب ''ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار ونظریات تنقید کی میزان میں'' شائع ہوئی جس سے ڈاکٹر اسرار صاحب پوری طرح آگاہ ہیں اور انہوں نے اس کتاب کو دیکھا بھی ہے۔ ہم نے اس کتاب میں نظریۂ ارتقاء پر مکمل بحث کی ہے اور ڈاکٹر اسرار صاحب کے دلائل کا جواب بھی دیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب غالباً غور کرنے کی زحمت ہی نہیں اٹھانا چاہتے۔ اگر ہماری باتیں غلط تھیں تو کیا ہمیں اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ہماری اصلاح ہی کا سوچ لیتے اگر ہماری یہ کتاب آپ کی نظر سے گزری ہے تو آپ کا استغناء تعجب خیز ہے اور اگر نہیں گزری تو آپ کو اس کا مطالعہ دانش وفرقان کے تقاضے کے طور پر ضرور کرنا چاہیے۔ اس سمع خراشی کے بعد عرض ہے:

(ا) آپ کا سوال ہے کہ کیا ایسے شخص کے عقائد کو اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے۔

جواب: آپ تو صرف نظریۂ ارتقاء سے متعلق سوچ رہے ہوں گے ڈاکٹر اسرار صاحب تو مزید اور باتوں کی وجہ سے اہل سنت سے خارج ہیں مثلاً:

(الف) ڈاکٹر اسرار صاحب کا نظریہ ہے کہ اگر دل میں مثبت طور پر ایمان نہ ہو اور منفی طور پر کفر نہ ہو بلکہ دل کی حالت Zero Value ہو اور یہ شخص اطاعت و اعمال صالحہ کرتا رہے تو یہ حالت اسلام کی ہے اور اس کے اعمال مقبول ہیں۔ اس بات کو ڈاکٹر اسرار صاحب نے سورہ حجرات کی آیات "قَالَتِ الْاَعْرَابُ آمَنَّا......" سے اخذ کیا اور ان کا دعویٰ ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔

خیر ابن تیمیہ نے تو ایسا کہا ہی نہیں اور یہ ڈاکٹر اسرار صاحب کا اپنا کارنامہ ہے کہ

انہوں نے ابن تیمیہ کی بات کو کچھ کا کچھ بنا دیا لیکن سورہ حجرات سے یہ مضمون اخذ کرنا جہاں ڈاکٹر صاحب کی مذموم تفسیر بالرائے ہے وہیں یہ اہل سنت کے خلاف بھی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَ مَنْ يَّعْمَلُ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْ مِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ۔

ترجمہ: اور جو کوئی نیک عمل کرے اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو اس کے عمل کی ناقدری نہیں ہے۔

وَهُوَ مُؤْمِنٌ بطور شرط کے ہے یعنی دل میں ایمان ہو تو عمل مقبول ہوں گے ورنہ نہیں۔ اہل سنت کا اتفاق ہے کہ ایمان وتصدیق کے بغیر اعمال مقبول نہیں۔ اس وجہ سے ڈاکٹر اسرار صاحب کا عقیدہ ونظریہ ہی نہیں بلکہ وہ خود بھی اہل سنت سے خارج ہیں۔

(ب) پھر ڈاکٹر اسرار صاحب کہتے ہیں:

''لیکن اللہ اور اس کے رسول کی یہ اطاعت کلی ہو جزوی نہ ہو الا یہ کہ کسی وقت جذبات و ہیجان میں مبتلا ہو کر کوئی لغزش ہو جائے اور نہایت پشیمانی کے ساتھ رجوع کرے توبہ کرے تو اور بات ہے۔ اللہ نے اس کی توبہ قبول کرنے کا ذمہ لیا ہے "اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ" اس کے مقابلے میں ایک معصیت سوچ سمجھ کر Calculations کر کے مستقل ڈیرہ ڈال کر کی تو ایسا ایک گناہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنمی بنانے کے لیے کافی ہے بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ"۔

جواب: صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ جہنم سے مٹھی بھر کر ایسے لوگوں کو نکالیں گے جنہوں نے ایمان وتصدیق کے علاوہ کبھی کوئی اور نیک کام ہی کیا ہی نہ ہوگا۔

فیقبض قبضة من النار فیخرج منها قوما لم یعملوا قط...... هولاء عتقاء الله الذین ادخلهم الله الجنة بغیر عمل عملوه ولا خیر قدموه۔ (مسلم ص 102 ج 1)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک مٹھی بھر کر ایسے جہنمیوں کو اس سے نکالیں گے جنھوں نے کوئی نیک عمل کیا ہی نہیں ہوگا...... کہا جائے گا کہ یہ اللہ کے آزاد کردہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے جنت میں داخل کیا بغیر کسی عمل کے جو انہوں نے کیا ہو اور بغیر کسی بھلائی کے جو انہوں نے آگے بھیجی ہو۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس Category کے لوگ ہوں گے۔ اہل سنت تو یہی سمجھتے رہے کہ یہ لوگ وہ نہیں جن سے کوئی وقتی لغزش ہوگئی بلکہ یہ وہ ہیں جو بے فکری سے منصوبے بنا کر گناہ کرتے رہے۔

(ج) نظریہ ارتقاء

ڈاکٹر اسرار صاحب جدید فلسفہ و سائنس میں ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے فکر کی تقلید میں جس ارتقاء کے قائل ہیں اور اس کو قرآن سے ثابت کرتے ہیں اہل سنت اس کو قرآن و حدیث کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس نظریہ اور عقیدہ کی رو سے بھی ڈاکٹر اسرار صاحب اہل سنت سے خارج ہیں۔

(2) آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کا عقیدہ رکھنے والا حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ گستاخی کا مرتکب قرار پائے گا؟

جواب: ایسا شخص صرف حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ہی گستاخی کا مرتکب نہیں بلکہ قرآن و حدیث کے ساتھ بھی گستاخی کا مرتکب ہے۔ وہ اس طرح کہ قرآن پاک میں ہے۔

(الف) اِنَّ مَثَلَ عِيُسىٰ عِنُدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنُ تُرَابٍ

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال ایسی ہے جیسے آدم کی مثال پیدا کیا ان کو مٹی سے''

اس کے بارے میں علامہ رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نجران کے وفد کے نبی ﷺ

کے پاس آنے کے وقت نازل ہوئی۔ ان کے شبہات میں سے ایک شبہ یہ تھا کہ انہوں نے کہا اے محمد ﷺ جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بشری والد نہ تھے تو لازم آیا کہ ان کے والد اللہ تعالیٰ ہوں تو آپ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کے نہ باپ تھے نہ ماں۔ ان کے لیے تو یہ لازم نہیں ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہوں تو ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ (تفسیر کبیر)

(ب) وَبَدَأَ خَلُقَ الُاِنُسَانَ مِنُ طِيُنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسُلَهٗ مِنُ سُلَالَةٍ مِنُ مَّاءٍ مَهِيُنٍ۔

''اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل کو ایک بے قدر پانی سے (یعنی نطفہ) سے پیدا کیا۔''

''الانسان'' میں الف لام عہد کا ہے اور مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ ''ثم'' تراضی کے لیے ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ اس کے بعد ان کی نسل کو نطفہ سے پیدا کیا جب کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کے نظریہ کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام بھی نطفہ ہی سے پیدا ہوئے تھے۔

(ج) يَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوُا رَبَّكُمُ الَّذِىُ خَلَقَكُمُ مِنُ نَفُسٍ وَاحِدَةٍ وَ خَلَقَ مِنُهَا زَوُجَهَا وَ بَثَّ مِنُهُمَا كَثِيُرًا وَّ نِسَاءً۔

ترجمہ: ''اے لوگو اپنے پروردگار (کی مخالفت) سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان دونوں سے بہت مردوں اور عورتوں کو پھیلایا۔

نفس واحدۃ سے اس کا زوج پیدا کیا پھر جیسا کہ منہما کی ضمیر سے واضح ہے اسی نفس واحدۃ اور اسی سے پیدا کیے ہوئے زوج سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پیدا کیا۔

ضمائر کا خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار صاحب صاف واضح مطلب کو چھوڑ کر نہ جانے اس آیت کا کیا مطلب لیں گے۔ قرآن پاک کے اس مضمون کے عین موافق

احادیث کا مضمون بھی ہے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نظریہ ارتقاء کو اختیار کر کے قرآن کی گستاخی کے مرتکب ہوئے اوران کواس وعید سے ڈرنا چاہئے کہ من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعدہ من النار (حدیث) جس نے بغیر علم کے قران میں کچھ کہا یعنی اس کا مطلب بتایا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔اور حدیث کی گستاخی کے بھی مرتکب ہوئے کہ حدیث کے الفاظ کو علامتی اور استعاراتی نوعیت کے الفاظ پر محمول کرتے ہیں اور وہ بھی محض ایک قیاس آرائی(Speculation) پر۔نظریہ ارتقاء اب تک محض ایک (Speculation) ہی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کے والدین کو زمرہ حیوانات میں شمار کیا بلکہ خود ان کو بھی روح پھونکے جانے تک زمرہ حیوانات میں ہی رکھا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان سب گمراہیوں اور خرافات کے لیے ڈاکٹر اسرار صاحب حدیث انتم اعلم بامور دنیا کم کا سہارا لیتے ہیں جو عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔امور دنیا سے کیا مراد ہے؟ یہاں بھی ڈاکٹر اسرار صاحب سخت غلطی کر گئے۔جس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امور دنیا سے مراد وہ دنیوی کام ہیں جن کے طریقہ کے بارے میں دین نے خود کوئی ہدایات نہیں دیں اور وہ لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش یعنی انسان کا مبدأ ایسا کام تو نہیں جو انسان کے دائرہ اختیار اور دائرہ کار میں آتا ہو۔یہ تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور یہ اللہ اور اس کے رسول ہی کے لائق ہے کہ وہ ہمیں ہمارے مبدأ کے بارے میں بتائیں۔

امید ہے کہ اب آپ اپنے اس دعوے پر کہ ”وہ شخص اسلاف کی تشریحات کے مطابق درس قرآن بھی دیتا ہے“ نظر ثانی کریں گے۔مٹی کا پتلا بنا کر اس میں روح پھونکنا اور امیبا(Amoeba) سے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے جب حیوان انسانی قالب میں تبدیل ہوا اس وقت روح پھونکنا یہ دو متضاد نظریات ہیں۔ان دونوں کا اجمالی تصور ہر شخص کر سکتا ہے۔خواہ وہ طالب علم ہو یا سرے سے ان پڑھ ہو۔

سائنسی تحقیقات کے اعتبار سے قرآن کی تفسیر کے بارے میں ڈاکٹر اسرار صاحب کا جو فلسفہ ہے اس کے بارے میں ہماری کتاب ”ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار و نظریات۔

تنقید کی میزان میں“ کے صفحات 42 تا 49 ملاحظہ فرمائیں۔

چند وضاحتیں:

(ا) وَلَقَدْ خَلَقْنَا كُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَا كُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدم۔ (سورہ اعراف: 11)

”اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے تمہیں صورت دی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو“۔

آپ نے لکھا ہے کہ اس آیت سے ڈاکٹر اسرار صاحب کے ذکر کردہ ارتقائی مراحل کی تائید ہوتی ہے۔

ہم کہتے ہیں: صریح مطلب کو چھوڑ کر نسبتاً غیر صریح آیات سے ڈاکٹر صاحب اپنے لیے تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی غلط ہے۔ خَلَقْنَاکُمْ کا یہاں مطلب ہے کہ ہم نے تمہارا مادہ بنایا بایں طور کہ روئے ارض سے مٹی لی اور اس میں خمیر پیدا کیا یہاں تک کہ وہ گارا بن گئی۔ پھر اس گارے سے آدم علیہ السلام کا پتلا تیار کیا۔ اس احتمال کے ہوتے ہوئے دوسرے احتمال کی طرف جانے کی ترجیح کس وجہ سے ہے۔ علاوہ ازیں صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے اس میں بات کتنی واضح ہے:

لما صور اللّٰہ آدم فی الجنة ترکه ماشاء اللّٰہ ان یترکه فجعل ابلیس یطیف به فینظر ماهو۔ فلما راہ اجوف عرف انه خلق خلقا لایتمالك۔

”جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں آدم کی صورت بنائی تو جب تک چاہا اس کو چھوڑے رکھا۔ ابلیس اس کے گرد گھومنے لگا کہ دیکھے یہ کیا ہے۔ جب دیکھا کہ اندر سے کھوکھلا ہے تو جان لیا کہ ان کو ایسا پیدا کیا کہ ان میں ثبات نہ ہوگا۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۔

”اور اللہ نے اگایا تم کو زمین سے اگانا“ (سورہ نوح)

میں بھی یہی بات چلتی ہے۔

(2) آپ ڈاکٹر اسرار صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ اس بات کے شدت سے قائل ہے کہ اسلامی قانون وشریعت میں
قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ حدیث وسنت رسول کو بھی مستقل اساس کی حیثیت
حاصل ہے بلکہ اس کا کہنا ہے کہ احکام دین کی تفصیلات کے ضمن میں
اکثر معاملات میں ہمیں تمام تر رہنمائی سنت رسولؐ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔''

ہمیں افسوس ہے کہ حدیث وسنت کا مقام بتاتے ہوئے ڈاکٹر اسرار صاحب نے صرف اس کی قانونی وتشریعی حیثیت کو بیان کیا ہے قانون وشریعت کے علاوہ دیگر امور مثلاً عقائد کے بارے میں حدیث کی حیثیت کوسرے سے بیان ہی نہیں کیا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ ڈاکٹر اسرار صاحب غیر قانونی امور میں حدیث کو رہنما نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ڈاکٹر اسرار صاحب کو اس بارے میں واضح بیان دینا چاہیے اور اپنی فکری اساس کو درست کرنا چاہیے۔

(3) آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''صاحب قصص القرآن مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی مانند وہ یہ بھی سمجھتا
ہے کہ اس معاملہ میں علم (ارتقاء) اور مذہب کے مابین کوئی تضاد نہیں ہے۔''

یہاں بھی معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ آپ نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ مولانا سیوہارویؒ نے شروع ہی میں لکھ دیا کہ ارتقاء کا یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ انسان اپنی ابتدائی تخلیق وتکوین ہی سے انسان پیدا نہیں ہوا بلکہ کائنات ہست و بود میں اس نے بہت سے مدارج طے کر کے موجودہ انسانی شکل حاصل کی......اور مذہب یہ کہتا ہے کہ خالق کائنات نے انسان اول کو آدم علیہ السلام کی شکل میں ہی پیدا کیا۔ ان کے مابین تضاد کی نفی تو نہیں کی جا سکتی۔ مولانا سیوہاروی نے تو شائد اس پر تفصیل سے کچھ نہیں لکھا لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ عمل ارتقاء کو جانوروں تک ہی رکھا جائے اور انسان کی علیحدہ اور مستقل تخلیق مانی جائے تو اس طریقے سے علم (ارتقاء) اور مذہب کے مابین کوئی تضاد نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

عبدالواحد غفرلہ

26 ذیقعدہ 1422ھ

ڈاکٹر اسرار صاحب اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مولانا سید محمود میاں مدظلہ

گرمی ہنگامہ ہے تیری حسین احمد سے آج
جن سے ہے پرچم روایاتِ سلف کا سربلند

☆

شعار اس کا بزرگانِ سلف کا زہد وتقویٰ ہے — جہاد اس کا نہیں پابندِ قید سبحہ گردانی
وہ جسکی خلوتِ شب کی بدولت اب بھی تازہ ہے — گداز بوذر وعشق اویس وسوزِ مسلمانی

☆

شیخ الاسلام حضرت اقدس سیّدنا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز ماضی قریب کی وہ نامور شخصیت ہیں کہ جو محتاجِ تعارف نہیں برصغیر بالخصوص ہندو پاک میں جو بھی تحریکات ہیں جن کا مقصد اسلام کی سربلندی ہے انکا سررشتہ بالواسطہ یا بلا واسطہ حضرت اقدس شیخ الاسلامؒ سے جا ملتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی، وہاں بسنے والے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور اس سرزمین میں دین پر ثابت قدم رہنے کی تلقین، شعائر اسلام کا احیاء، تعلیم وتعلم، رجال کار کی فراہمی، تزکیہ نفس واصلاحِ احوال، غرض ہر شعبہ کی روح رواں حضرت اقدسؒ کی ذات والا صفات ہی ہے۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کے ''طبل'' کی گونج جس سے فی الوقت سارا عالم لرزاں ہے حضرتؒ ہی کی قربانیوں کا ثمرہ ہے۔

حضرت مولانا السیّد ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت رحمہ اللہ کے بارے میں میں تحریر فرماتے ہیں :

مولانا کا ایک بڑا کارنامہ جس کی اہمیت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمان کی بقا وقیام کا ایک بڑا

ظاہری سبب مولانا ہی کی ہستی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ بڑے بڑے کوہِ استقامت جنبش میں آ گئے سب یہی سمجھتے تھے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں مسلمانوں کی تاریخ میں دو ہی چار دور ایسے گزرے ہیں جب مسلمان اور اسلام کی بقا کا سوال آ گیا۔ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں اسی نوعیت کا تھا۔ اصل مسئلہ سہارنپور کے مسلمانوں کا تھا اور سارا دارومدار ان پر تھا۔ یہ اپنی جگہ چھوڑتے تو یوپی کے مسلمانوں کے قدم لغزش میں آ جاتے۔ سہارنپور کے مسلمانوں کا انحصار سارا کا سارا دو ہستیوں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا مدنی ؒ پر تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ جمنا کے کنارے ہونا تھا لیکن یہ دو صاحب عزم مجاہد بندے وہاں جمع رہے۔ ایک رائے پور کی نہر کے کنارے بیٹھ گیا اور ایک دیوبند میں۔ آپ کو معلوم ہو گا یہ رائے پور اور دیوبند مشرقی پنجاب کے ان اضلاع سے متصل ہیں جہاں کشت و خون کا ہنگامہ گرم تھا لیکن یہ اللہ کے بندے پورے عزم و استقلال کے ساتھ جمے رہے اور انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اسلام کو یہاں رہنا ہے اور رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہاں سے نکلنا صحیح نہیں اگر تم مشورہ چاہتے ہو تو ہم مشورہ دیتے ہیں اگر فتوے کی ضرورت ہو تو ہم فتویٰ دینے کو تیار ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں جو مسجدیں قائم ہیں اور ان میں جو نمازیں پڑھی جا رہی ہیں اور پڑھی جاتی رہیں گی یہ ان کا طفیل ہے۔ ہندوستان میں جتنے مدرسے اور خانقاہیں قائم ہیں اور جو فیوض و برکات ان سے صادر ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ انہی کے مرہونِ منت ہوں گے اور ان سب کا ثواب ان کے اعمال نامے میں لکھا جاتا رہے گا۔ اس سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنیؒ نے سارے ملک کا دورہ بھی کیا، ایمان آفریں اور ولولہ انگیز تقریریں بھی کیں اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ اپنی تقریروں اور خود اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے اور اپنے ملک کو اپنا سمجھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔ (ماخوذ از واقعات صفحہ ۲۱۹)

اس تمہید کا مقصد ایک اہم اور ناخوشگوار واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے جو ۱۰/ دسمبر

۲۰۰۲ء کے روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوا۔ ملاحظہ فرمائیں :

ادارہ ’’ہم سخن ساتھی‘‘ کی جانب سے معروف سرجن ڈاکٹر عامر عزیز کے اعزاز میں منعقدہ عشائیہ کے اختتام پر چیف ایڈیٹر نوائے وقت جب تقریر ختم کر کے واپس اپنی نشست کی طرف آئے تو تنظیم اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد نے ان سے مخاطب ہو کر کہا نظامی صاحب میں مولانا حسین احمد مدنی کا پیروکار نہیں ہوں۔ اس پر جناب مجید نظامی نے کہا کہ آپ منبر رسول پر کھڑے ہو کر مولانا مدنی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ صرف اس وجہ سے میں نے آپ کی جامع مسجد میں نماز پڑھنی چھوڑ دی۔ مجید نظامی کے ان کلمات پر ڈاکٹر اسرار احمد دم بخود رہ گئے اور خالی خالی نظروں سے مجید نظامی کی طرف دیکھتے رہے۔

ملک کے نامور صحافی اور ایک بڑے روزنامہ کے چیف ایڈیٹر ہونے کی حیثیت سے جناب مجید نظامی صاحب کو اس قسم کی دریدہ دہنی اور تنگ نظری زیب نہیں دیتی اگرچہ یہ اپنی مخصوص ’’شخصی فکر‘‘ کے اعتبار سے ان کو کتنی ہی زیبا ہو۔ حضرت مدنی ؒ سے کسی کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مگر وہ ان کی خدا پرستی، برگزیدگی اور ملی خدمات کا بہر حال اعتراف کرتا ہی ہے۔ نظامی صاحب بتائیں کیا حضرت مدنی ؒ کی تعریف کرنا ایسا جرم ہے کہ اس کی وجہ سے انسان العیاذ باللہ کافر ہو جاتا ہے یا کم از کم اس درجہ کا فاسق ہو جاتا ہے کہ اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔

ہم نے سنا ہے کہ مجید نظامی صاحب مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کے بہت عقیدت مند ہیں جبکہ وہ حضرت اقدس مدنی ؒ ہی سے بیعت تھے۔ اگر یہ بات درست ہے تو نظامی صاحب اپنی اس فکری بے راہ روی کی کیا توجیہ فرمائیں گے!

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

ہم نظامی صاحب کی خیر خواہی کی خاطر عرض کرتے ہیں کہ اہل اللہ سے بلاوجہ کا بغض و کینہ ان کا کچھ نہیں بگاڑتا البتہ نظامی صاحب کے لیے دنیا و آخرت کے اعتبار سے یہ خطرناک ہے۔ بخاری شریف کی حدیث قدسی ہے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان اللّٰہ تعالیٰ قال مَنْ عَادَی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ ....(مشکوٰۃ شریف ص۱۹۷)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے دوست سے عداوت رکھے گا اس سے میرا اعلانِ جنگ ہے۔''

اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی عداوت سے بچائے اور ان کا ادب واحترام ہر حال میں ملحوظ رکھے یہ چیز اس کے ایمان کی سلامتی کے لیے ضروری ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے بارے میں جنگ کا اعلان فرمادیں تو اس جنگ میں اس بندے کی ذلت وشکست یقینی ہوتی ہے اور بچ نکلنے کے امکانات بالکل مسدود ہوتے ہیں۔عبرت کے لیے ایک دو واقعات کا ذکر اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے:

''ایک مرتبہ بہاولپور سے حضرت کے یہاں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب تشریف لائے اُنھوں نے حضرت کے سامنے امرتسر کے رہنے والے ایک صاحب کے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت مدنی ؒ کے ساتھ جو گستاخیاں کی تھیں اُن کی سزا دنیا ہی میں مل گئی جس طرح ہم نے حضرت کے سامنے بدتہذیبی کا ننگا ناچ ناچا تھا، ہمارے سامنے ہماری بہو بیٹیوں کو سر بازار نچایا گیا۔خدا اگر مجھے پر دیدے تو میں اُڑ کر حضرت مدنی کی خدمت میں پہنچوں اور اُن سے معافی طلب کروں۔حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باتیں سُن کر اظہار افسوس کیا اور اُن صاحب کو معاف کر دیا۔''

دُوسرا واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیں :

''حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھاگل پور تشریف لائے ہوئے تھے حاجی ایوب صاحب چلبل کے توسط سے ایک نابینا آیا اور یوں عرض کرنے لگا کہ: حضرت! جب آپ لیگ کے دور میں بھاگل پور تشریف لائے تھے تو میں ہی وہ شخص تھا جس نے آپ کو کالی جھنڈی دکھائی تھی اور گالیوں کے ساتھ پتھر پھینکے تھے۔ ہوا یہ

کہ واپسی کے وقت ابھی راستے ہی میں تھا کہ میری دونوں آنکھیں بصارت سے محروم ہو گئیں،توبہ کی غرض سے مسجد میں گیا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی شخص وہاں سے دھکے دے کر نکال رہا ہے۔حضرت! میری دنیا تو برباد ہو گئی۔اب آخرت کے لیے دُعا کر دیجیے اور میں نے جو قصور کیا ہے اُسے معاف کر دیجیے!

اس شخص کا اندازِ بیان ایسا تھا کہ حاضرین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔بہر حال حضرتؒ نے اُسے بڑی شفقت ومحبت سے اپنے پاس بٹھایا اور تمام حاضرین کے ساتھ اُس کے حق میں دُعا فرمائی نیز اُس کو معاف کر دیا۔''

(شیخ الاسلامؒ کے حیرت انگیز واقعات مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کراچی ص ۴۸ و ۵۲)

حضرت مدنی ؒ کا ولایت کے اعتبار سے مرتبہ ومقام اتنا بلند ہے کہ ان کے زمانہ کے اور ان کے بعد کے زمانہ کے تمام اہل اللہ بالاتفاق ان کو سب سے بڑا ولی اللہ تسلیم کرتے ہیں۔ان کے خلفاء اور شاگردوں میں سینکڑوں اہل اللہ اور صاحب کشف و کرامات بزرگ گزرے ہیں اور بہت سے بحمد اللہ بقید حیات بھی ہیں۔افغانستان کے پچیس سال سے جاری جہاد کے سرخیل حضرت مدنی ؒ کے شاگرد یا ان کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ان کے فیوض و برکات بحر بے کنار کی مانند ہیں، نظامی صاحب کے اس اندازِ گفتگو نے افغانستان پر امریکی جارحیت کے خلاف ان کی صحافتی خدمات کے اخلاص کو داغدار کر دیا ہے۔ پورے ملک کے دینی حلقوں میں ان خدمات کے صلہ میں جو ان کو ایک مقام حاصل ہوا تھا یکدم پاش پاش ہو گیا ہے۔ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ شرم و عار کی پروا کیے بغیر اپنی اس گستاخی اور دل آزاری پر اللہ سے بھی معافی مانگیں اور دینی حلقوں سے بھی۔مرحوم علامہ اقبال سے نظامی صاحب کی عقیدت و نیاز مندی بھی اسی کا تقاضہ کرتی ہے، ایک موقع پر علامہ اقبال مرحوم نے غلطی فہمی کی بنیاد پر حضرت اقدس مدنی ؒ کے خلاف چند اشعار کہے تھے کچھ حضرات کی کوششوں سے بعد کو اس غلط فہمی کا ازالہ ہو گیا تو علامہ اقبال مرحوم نے بلا تاخیر واشگاف الفاظ میں اپنے اعتراض سے نہ صرف رجوع کیا بلکہ نیاز مندانہ کلمات سے گزشتہ رویہ کی تلافی کی۔علامہ مرحوم کی تحریر ملاحظہ فرمائیں :

''خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا لہذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اعتراض کرنے کا نہیں رہتا میں مولانا کے ان عقیدت مندوں کے جوش عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنہوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلہ میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں، خدائے تعالی ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید فرمائے نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں''۔(اقبال)

(اقبال کے ممدوح علماء صفحہ ۸۷)

☆☆☆

نیز پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم جو لیگی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں لیگ کے لیے ان کی گرم جوش خدمات کسی سے مخفی نہیں ہیں۔حضرت مدنیؒ کی شان میں اپنے گستاخانہ رویہ کے خود معترف ہیں اپنے اس ناروا طرزِ عمل پر آگاہی کے بعد نادم و شرمسار ہو کر تحریر فرماتے ہیں :

''گزشتہ زندگی (۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۴ء) میں مجھ سے جس قدر گستاخیاں حضرت اقدس مجاہد اعظم شیخ الاسلام آیۃ من آیات اللہ الصمد سیّدی و شیخی وسندی الحاج الحافظ المولوی السیّد حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کی شان رفیع البیان میں سرزد ہوئی ہیں ان پر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے غیر مشروط انداز میں اظہار ندامت اور اعتراف تقصیر اور اقرار جرم کروں اور بارگاہ ایزدی میں صدق دل سے استغفار کروں''۔

(اقبال کے ممدوح علماء صفحہ ۷۵)

آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں :

''اے اللہ میں صدق دل سے توبہ کرتا ہوں، میری لغزشوں، خطاؤں اور

گستاخیوں کو معاف کردے جو میں نے اپنے شیخ طریقت، مخدوم ملت، محرم راز نبوت، واقف اسرار رسالت اور آشنائے مقام محمدی (علیہ افضل التحیۃ والثناء) کی شان میں روا رکھی تھیں۔اے اللہ اپنے مقبول بارگاہ بندوں کو توفیق عطاء فرما کہ وہ میرے حق میں معافی کے لیے دعا کریں مجھے یقین ہے کہ تو ان کے وسیلے سے مجھ پر کرم کرے گا اور مجھے میرے شیخ، بلکہ شیخ العرب حضرت مدنیؒ کی نسبت عالیہ سے حصہ وافر عطا فرمائے گا اور مجھے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔ **رب تقبل منی انک انت السمیع العلیم وتب علی انک انت التواب الرحیم وصلی اللّٰہ تعالی علیٰ حبیبه وعبده و رسوله الکریم.**''(اقبال کے ممدوح علماء صفحہ ۷۷)

اپنی توبہ کی مزید تکمیل کی غرض سے پروفیسر صاحب مرحوم نے غالبًا والد گرامی حضرت اقدس مولانا سید حامد میاں قدس سرہ العزیز کے دست حق پرست پر بیعت بھی کر لی تھی۔ واللہ اعلم

☆☆☆

دوسری طرف ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سربراہ تنظیم اسلامی نے نہ معلوم کونسی مصلحت کے پیشِ نظر جناب مجید نظامی صاحب کے حضور حضرت اقدس مدنیؒ کے ساتھ اپنے تعلق سے برأت کا اظہار کیا جبکہ واقفانِ حال پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح پہلے ہی سے واضح ہے کہ ڈاکٹر صاحب حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے پیروکاروں میں سے نہیں ہیں اور نہ پہلے کبھی تھے اگرچہ اس حقیقت کے برملا انکشاف سے ماضی میں ڈاکٹر صاحب کو ان کی مخصوص مصلحتیں روکے رہیں ہوں بلکہ اس سے بڑھ کر بعض مواقع پر انہی مصالح کی خاطر حضرت اقدسؒ کی مدح و ثناء بھی کرتے رہے ہوں۔

کون نہیں جانتا کہ عام و خاص میں سے ایسے افراد بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جو حضرت مدنیؒ کے پیروکاروں میں سے تو نہیں ہیں مگر ان کی مجاہدانہ خدمات اور رفعتِ شان کے خلوص دل سے معترف ہیں بلکہ عقیدت مند بھی ہیں مگر ڈاکٹر صاحب موصوف

نے جس بھونڈے اور نامناسب انداز میں نظامی صاحب کے حضور حضرت مدنیؒ کی پیروکاری سے برأت کا اظہار فرمایا اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ حضرت اقدسؒ کی عقیدت مندی اور خدمات کا اعتراف کسی خاص مصلحت کے لیے بتکلف تو کر سکتے ہیں یا کرتے رہے ہیں لیکن خانۂ دل اس کی حلاوت سے بہر حال ناآشنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجید نظامی صاحب اور ڈاکٹر اسرار صاحب کو اپنے رہبر و راہنما مرحوم علامہ اقبال سے بھی اس درجہ عقیدت و فریفتگی نہیں جو ایک سچے پیروکار کو ہونی چاہیے ورنہ کم از کم علامہ مرحوم کی اتباع میں حضرت مدنیؒ سے اتنی عقیدت تو رکھتے جس کا علامہ مرحوم نے برملا اظہار فرمایا ہے۔

جناب نظامی صاحب کے حضور ڈاکٹر صاحب کی خادمانہ برأت کی بظاہر کوئی دینی وجہ تو نہیں ہو سکتی کوئی دنیاوی مفاد ہی اس وقت ان کے پیشِ نظر ہوگا مگر اللہ والوں سے بیزاری اللہ کے غصہ کو دعوت دیتی ہے جس کا نقد عتاب ڈاکٹر صاحب پر اسی وقت بھری مجلس ہی میں نازل ہو گیا کہ نظامی صاحب نے ان کی برأت کو اسی وقت پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور صحافت کی زردی ڈاکٹر صاحب کو نیلا پیلا کر گئی۔ اخبار لکھتا ہے مجید نظامی صاحب کے ان کلمات پر ڈاکٹر اسرار احمد دم بخود رہ گئے اور خالی خالی نظروں سے مجید نظامی کی طرف دیکھنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب کی بے موقع بات کے جواب میں نظامی صاحب کی اس نامعقول اور غیر سنجیدہ گفتگو کے دسیوں معقول جواب اسی وقت دیئے جا سکتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب سے ایک زیرک انسان ہونے کے باوجود کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ مبہوت ہو کر رہ گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جب انسان اللہ کو چھوڑ کر مخلوق کی خوشنودی میں لگ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق ہی کے ہاتھوں خجالت سے دوچار کرا دیتا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے مسلّم جانشین ان کی روایات کے امین حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ سے بیزار ہو کر ڈاکٹر صاحب اپنے کو حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے کیسے وابستہ کر سکتے ہیں اس سلسلہ کی تمام محنت جو ڈاکٹر صاحب بڑی گرم جوشی سے کرتے رہے ہیں

اور اس بارے جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی کے نام سے ایک کتاب بھی لکھ چکے ہیں۔ ۹/دسمبر کے اس مکالمہ کے بعد ڈھیر ہو چکی ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۲ پر مودودی صاحب کے حالات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں :

''..........لیکن جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ علماء کرام اور خاص طور پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے عقیدت مندوں کا اکثر وبیشتر حلقہ ان سے (مودودی صاحب سے) شدید بیزار ہو گیا اور دور رس نتائج اور دیر پا عواقب کے اعتبار سے یہی چیز ان کے قدموں کی زنجیر اور ان کی ناکامی کا بڑا سبب بن گئی!

عجیب بات ہے اپنی ہی رائے سے سبق حاصل کرنے کے بجائے ڈاکٹر صاحب موصوف نے خود اپنے قدموں کی زنجیریں تیار کرنا شروع کر دیں!

☆☆☆

جب میرا بچپن تھا اس وقت سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی والد گرامی حضرت اقدس مولانا سیّد حامد میاں صاحب نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں نیاز مندانہ آمد و رفت تھی، اسی تعلق اور عمر کی بڑائی کا تقاضا تھا کہ ادب و مروت کی حدود کا خیال رکھا جائے مگر افسوس کہ ۹/دسمبر کے ناخوشگوار واقعہ میں خود ڈاکٹر صاحب نے اس خوشنما عمارت کو زمین بوس کر کے ہمارے لیے وہ خاردار راہیں ہموار کر دیں جن کو خواہی نہ خواہی ہم کو عبور کرنا ہی پڑ گیا۔ فحسبنا اللہ ونعم الوکیل.

(ماخوذ از ماہنامہ انوار مدینہ جنوری 2003ء)

حضرت شیخ الہندؒ، مولانا مدنیؒ اور بانی تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

ماہنامہ ’’انوارِ مدینہ‘‘ جامعہ مدنیہ لاہور کا جریدہ ہے۔ اس جامعہ کے مؤسس و مہتمم اور شیخ الحدیث مولانا سید حامد میاںؒ تھے...... جو مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مجاز بھی تھے اور ایک جید عالم دین ہونے کے علاوہ اصول تمدن و سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور جمعیت علماء اسلام کے پلیٹ فارم سے پاکستان کی سیاست میں بھی عملاً حصہ لیتے تھے، ’’انوارِ مدینہ‘‘ کی اشاعت بابت جنوری ۲۰۰۳ء میں مولانا سید حامد میاں کے صاحبزادے سید محمود میاں نے 9 دسمبر 2002ء کے واقعے کے ضمن میں مجھ پر جو ’’عنایات‘‘ فرمائی ہیں وہ کم از کم مولانا سید حامد میاںؒ کے فرزند کے شایان شان نہیں ہیں!

انہوں نے آخر میں یہ تو لکھ دیا کہ: ’’جب میرا بچپن تھا اس وقت سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی والدِ گرامی حضرت اقدس سید حامد میاں نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں نیاز مندانہ آمد و رفت تھی۔‘‘ مگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہ تعلق ہرگز یک طرفہ نہیں تھا بلکہ مولانا سید حامد میاںؒ بھی مجھ پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ چنانچہ جس زمانے میں میری تاسیس کردہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام سالانہ قرآن کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں حضرت مولاناؒ ہر بار ایک خصوصی مقالہ عنایت فرماتے تھے جسے مولوی محمود میاں کے برادر بزرگ مولوی رشید میاں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ مزید براں جب میں نے مولانا حامد میاںؒ کے سامنے اپنی رائے بیان کی کہ میرے نزدیک چودھویں صدی کے مجدد اعظم حضرت شیخ الہندؒ تھے...... تو مولاناؒ نے صد فی صد اتفاق فرمایا اور نہایت تحسین آمیز انداز میں فرمایا کہ: ’’حیرت ہوتی ہے کہ ہم میں سے کسی کی نگاہ ادھر کیوں نہ گئی۔ ہمارے یہاں کچھ لوگ حضرت تھانویؒ کو اس مقام و مرتبہ کا حامل سمجھتے رہے، اور کچھ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو!‘‘ ...... مزید برآں جب 1977ء میں ہم

نے تنظیم اسلامی کی تنظیمی اساس کے طور پر ’’بیعت‘‘ کی منصوص و مسنون و ماثور بنیاد کو اختیار کیا اور اس کا کچھ عرصے بعد اخبارات کے علاوہ ٹی وی کے ایک پروگرام ’’روبرو‘‘ میں بھی تذکرہ ہوا...... اور بعض علماء کی جانب سے اس پر تنقید ہوئی تو مولانا سید حامد میاںؒ ہی نے میری جانب سے مدافعت کی تھی اور اس ضمن میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے فرزند مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مقیم لندن کے نام ایک مفصل خط بھی تحریر فرمایا تھا! ...... اور یہ سب کچھ اس کے باوجود کہ مولانا حامد میاںؒ کو خوب معلوم تھا کہ میں جمعیت علماء ہند کی اس حکمت عملی سے شدید اختلاف رکھتا تھا جو مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی قیادت میں اختیار کی گئی تھی!

اب ایک جانب والد ماجد کا یہ طرز عمل اور دوسری جانب ان کے صاحبزادے کا یہ انداز کہ صرف طنز و استہزاء ہی نہیں تحقیر و تذلیل بھی ہے...... یہاں تک کہ نیت پر حملہ بھی!...... تو اس پر اس کے سوائے اور کیا عرض کیا جائے کہ ؎

’’زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!‘‘

یہ بات میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ چونکہ میں نے کسی عربی مدرسے سے تعلیم حاصل نہیں کی لہٰذا معروف معنی میں مَیں نہ دیوبندی ہوں، نہ بریلوی، نہ اہلحدیث...... البتہ میری دینی تربیت میں سب سے زیادہ اثر میری والدہ ماجدہ مرحومہ کا ہے...... اور ان کے اسلاف کا گہرا قریبی تعلق خانوادہ ولی اللہیؒ کے ساتھ تھا۔ چنانچہ ان کے اجداد میں سے مولوی محمد ابراہیمؒ اور مولوی محمد اسماعیلؒ اور مولوی محمد اسحٰقؒ ...... دہلی کے اسی قبرستان مہندیاں میں دفن ہیں جہاں خانوادہ ولی اللہی کے عظیم فرزند! ...... چنانچہ فطری طور پر میرا میلان طبع علمائے دیوبند کی جانب ہو گیا۔

پھر جب 1965ء میں میں گیارہ سال کی غیر حاضری کے بعد اپنے پیش نظر احیائی جدوجہد کے آغاز کے لیے واپس لاہور آیا تو اگرچہ میں نے نیاز مندانہ تعلق مولانا محمد حسین نعیمیؒ کے ساتھ بھی قائم کیا جو بریلوی مکتب فکر کے معروف عالم دین تھے۔ لیکن میرا زیادہ رجحان مولانا احمد علی لاہوریؒ کے قائم کردہ ادارے کے سربراہ اور ان کے جانشین

مولانا عبید اللہ انورؒ اور مولانا سید حامد میاںؒ کی جانب ہو گیا۔ ان میں سے مقدم الذکر سے ایک نسبت خصوصی یہ تھی کہ میں بھی اپنے مشن کا آغاز قرآن کے درس و تدریس سے کر رہا تھا، اور مجھے معلوم تھا کہ اسی ارض لاہور میں یہی کام حضرت مولانا احمد علیؒ چالیس سال تک کرتے رہے تھے! (بعد میں یہ معلوم کر کے تو مجھے بہت ہی مسرت اور انشراح صدر ہوا تھا کہ لاہور میں میرے درس قرآن کا آغاز جس مسجد سے ہوا یعنی مسجد خضراء سمن آباد، اس کا سنگ بنیاد حضرت لاہوریؒ ہی کا رکھا ہوا تھا!)...... تاہم چونکہ مولانا عبید اللہ انورؒ نے اپنی سرگرمی صرف ذکر و شغل تک محدود کر لی تھی اور صوفیاء کرام کی روایت کے مطابق زیادہ تر ''روپوش'' رہتے تھے، لہٰذا عملاً میری آمد و رفت اور استفادہ کا تعلق مولانا سید حامد میاںؒ کے ساتھ قائم رہا...... یہاں تک کہ وہ تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں بھی شامل رہے اور بعض مسائل میں انہوں نے میری آراء پر گرفت بھی فرمائی جو من و عن تنظیم کے جریدے ماہنامہ ''میثاق'' میں شائع کی گئی!......

اور اب آیئے حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا مدنیؒ کی نسبت کی جانب! جس کے ضمن میں مولوی محمود میاں نے تحریر فرمایا ہے کہ: ''حضرت شیخ الہندؒ کے مسلم جانشین ان کی روایات کے امین مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیزار (؟) ہو کر ڈاکٹر صاحب اپنے کو حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے کیسے وابستہ کر سکتے ہیں'' تو اس سلسلے میں یہ بات پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک حضرت شیخ الہندؒ چودھویں صدی ہجری کے مجدد اعظم اور الف ثانی کے اس سلسلہ مجددین کی آخری کڑی تھے جو ارض ہند میں وارد ہوئے...... یعنی گیارہویں صدی کے مجدد حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، بارھویں صدی کے شاہ ولی اللہ دہلویؒ، تیرھویں صدی کے سید احمد شہید بریلویؒ...... اور چودھوی صدی کے حضرت شیخ الہندؒ...... (اور اب پندھرویں صدی میں تو میرے گمان کے مطابق ان شاء اللہ سلسلہ مجددین کی آخری اور کامل کڑی حضرت مہدی موعود ہوں گے جن کا ظہور سرزمین عرب میں ہو گا!) اور جس طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کا تجدیدی کارنامہ زیادہ تر علمی تھا چنانچہ ان کی جامعیت کبریٰ کی مظہران کی تصانیف ہیں، اگرچہ ملکی حالات پر بھی ان کی گہری نگاہ

تھی اور انہوں نے مرہٹوں کا زور توڑنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو افغانستان سے بلایا تھا۔ اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ کا تجدیدی کارنامہ بھی زیادہ تر تعلیم و تدریس اور اصلاح و ارشاد کے میدان میں ظاہر ہوا...... تاہم استخلاص وطن کے لیے عملی جدوجہد میں بھی ان کا بہت نمایاں بلکہ بلا شبہ قائدانہ حصہ رہا ہے...... اور ان کی جامعیت کبریٰ کے مظہران کے شاگرد ہیں جن کے مزاج اور میدان کار کا تنوع حیرت انگیز ہے۔ یعنی علم تفسیر میں ان کے جانشین مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تھے، تو علم حدیث و فقہ میں یہی حیثیت مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ کو حاصل تھی۔ اسی طرح ان کی اندرونی شخصیت کی ''انقلابیت'' کی مظہر اتم شخصیت مولانا عبید اللہ سندھی کی تھی، تو زہد و ورع اور استخلاصِ وطن اور دار العلوم دیوبند میں درس و تدریس کے میدان میں ان کے جانشین کی حیثیت مولانا مدنیؒ کو حاصل ہوئی اور یہ میرے نزدیک ایک بہت بڑی تاریخی غلطی تھی!!

مولانا مدنیؒ حضرت شیخ الہند کے شیدائی تھے اور چار سالہ اسارتِ مالٹا کے دوران انہوں نے اپنے شیخ کی جو خدمت کی اس کی نظیر شاید ہی نظر آ سکتی ہو لیکن ہندوستان واپسی پر مختصر عرصۂ حیات میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے خطبات کی تحریر مولانا مدنیؒ سے نہیں بلکہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے کرائی (خطبہ علی گڑھ کی بھی اور دوسرے سالانہ اجلاس جمعیت علماء ہند کے خطبۂ صدارت کی بھی!) ...... پھر اسی اجلاس میں ''امام الہند'' کا خطاب دے کر جس شخص کی بیعت پر علماء کو آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش حضرت شیخ الہندؒ نے کی وہ بھی مولانا مدنیؒ نہیں مولانا ابوالکلام آزاد تھے!...... لہٰذا تحریک استخلاصِ وطن، تحریک حفاظتِ خلافت عثمانیہ، اور تحریک تجدید و احیاء و غلبۂ دین سب کے اعتبار سے حضرت شیخ الہندؒ کے جانشین اور ''خلیفہ مجاز'' کی حیثیت مولانا آزاد کو حاصل ہے! جن کے ہاتھ پر خود بیعت کرنے کی خواہش وہ اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گئے!...... یہ دوسری بات ہے کہ علماء نے اپنی تنگ نظری اور گروہی عصبیت کے زیر اثر حضرت شیخ الہندؒ کی اس تجویز پر غور کو عارضی طور پر تو ملتوی کر دیا...... لیکن پھر جب کچھ عرصہ بعد جمعیت علماء ہند ہندوستان کے جملہ مذہبی مکاتب فکر کی جامع اور نمائندہ جماعت نہ رہی بلکہ صرف

دیوبندی علماء کی تنظیم بن کر رہ گئی تو اس پورے معاملے کو ایسے دفن کر دیا کہ آج اس کا سراغ بھی تاریخ کے صفحات میں بہت ہی تلاش وتفتیش کے بعد مل سکتا ہے! (جس کے لیے ملاحظہ ہو میری تالیف: جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی!'') ...... دوسری جانب مولانا آزاد نے بھی کم ہمتی کا ثبوت دیا اور علماء کی تنگ نظری اور جمود سے بد دل ہو کر ''حکومت الٰہیہ'' کے قیام کے نصب العین اور اس کے لیے بیعت کی اساس پر قائم کردہ ''حزب اللہ'' کی بساط لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی اور خود صرف استخلاصِ وطن کی جدوجہد کے لیے انڈین نیشنل کانگریس میں باضابطہ شمولیت اختیار کر لی...... بہر حال مجدد عصر کی تجویز کو رد کر دینے کی سزا طبقہ علماء کو یہ ملی کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت علماء سے سلب کر کے جدید تعلیم یافتہ طبقات کے حوالے کر دی گئی۔

اب ذرا ایک نظر اس امر پر بھی ڈال لیجئے کہ حضرت شیخ الہند نے امام الہند کا منصب اپنے تلامذہ ومسترشدین کے حلقے کی کسی شخصیت کی بجائے مولانا آزاد کے لیے کیوں تجویز کیا تھا...... اس کی دو بنیادی وجوہات تھیں:

(۱) مولانا آزاد نے 1912ء سے 'الہلال' اور پھر 'البلاغ' کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کا جو غلغلہ بہت زور وشور سے بلند کیا تھا اس سے حضرت شیخ الہندؒ بہت متاثر ہوئے تھے اور انہیں محسوس ہو گیا تھا کہ ''کرنے کا اصل کام'' وہی ہے جس کی دعوت یہ نوجوان دے رہا ہے۔ (1912ء میں مولانا آزاد کی عمر کل چوبیس برس تھی!)...... چنانچہ یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ ان دونوں جریدوں سے بھی بہت لگاؤ رکھتے تھے اور 15-1914ء کے آس پاس مولانا آزاد کا ربط ضبط بھی حضرت شیخ سے بہت بڑھ گیا تھا۔ جس کا ایک ہلکا سا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ 1915ء میں کانپور کی مسجد کے ایک حصے کے شہید کئے جانے پر جو ہنگامہ ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں حکومتِ وقت اور مسلمانوں کے مابین شدید کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، اس کے ضمن میں مسلمانوں اور بالخصوص علماء دیوبند کی دلجوئی کے لیے یوپی کے انگریز لیفٹیننٹ گورنر نے دارالعلوم دیوبند کا دورہ رکھا جس کے دوران اسے دارالعلوم کے اساتذہ

اور طلبہ سے خطاب بھی کرنا تھا...... لیکن ساتھ ہی اس نے یہ پابندی بھی لگا دی کہ اس جلسے میں ابوالکلام آزاد شریک نہ ہوں اور دارالعلوم کی انتظامیہ نے اس شرط کو قبول کر لیا تو...... حضرت شیخ الہندؒ نے بھی جلسے میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اور جب کچھ بزرگوں نے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی کہ ''آپ ایک نوجوان کو کیوں اس قدر اہمیت دے رہے ہیں!'' تو حضرت شیخ نے جواباً یہ شعر پڑھا ؎

کامل اس طبقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے!

پھر یہی سبب تھا اس کا کہ جب 1920ء میں شیخ الہندؒ مالٹا کی اسیری سے رہا ہو کر ہندوستان واپس آئے اور دارالعلوم دیوبند میں علماء کا ایک بڑا جلسہ ہوا تو اس میں انہوں نے فرمایا:

> ''ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں۔'' یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں۔ فرمایا کہ:
>
> ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے مَیں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے، بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کئے جائیں، بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

(بحوالہ ''وحدت ملت'' تالیف مولانا مفتی محمد شفیعؒ)

(2) اور دوسرا اور اہم تر سبب یہ تھا کہ 1915ء میں جب حضرت شیخ کے حلقے میں

ہندوستان کی آزادی کے ضمن میں اس تجویز پر گفت وشنید ہو رہی تھی کہ ایک طرف ہندوستان میں ہم علم بغاوت بلند کریں اور دوسری طرف ''خلافت عثمانیہ'' اور امارتِ افغانستان سے درخواست کی جائے کہ وہ حملہ کریں تا کہ اس دوہری یورش سے برطانوی حکومت عہدہ برآ نہ ہو سکے تو اس وقت مولانا آزاد نے حضرت شیخ ؒ سے کہا تھا کہ ''حضرت! اب زمانہ بدل گیا ہے، اب نہ کوئی مدد آپ کو خلافت عثمانیہ سے ملے گی نہ امارت کابل سے، بلکہ آپ کو یہیں ہندوستان میں بیٹھ کر عوامی تحریک چلانی ہوگی!'' تو اس وقت تو جذبات کے جوش وخروش میں ان کی بات کسی نے نہ سنی...... لیکن جب شیخ الہندؒ اس مشن پر حجاز گئے تا کہ مدینہ منورہ کے ترک گورنر کے ذریعے دارالخلافت سے بات کریں...... تو انہیں وہاں سے شریف مکہ نے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا اور یہی حشر مولانا عبید اللہ سندھی کا کابل میں ہونے والا تھا کہ وہ بروقت مطلع ہو گئے اور کابل سے فرار ہو کر روس چلے گئے...... قصۂ مختصر یہ کہ جب چار سال کی جلا وطنی اور نظر بندی جھیل کر شیخ الہندؒ واپس ہندوستان آئے تو انہیں یقین کامل ہو گیا تھا کہ حالاتِ وقت کی نبض پر ہاتھ ہم بوڑھوں کا نہیں، اس نوجوان کا ہے!...... بہرحال تحریک آزادیٔ ہند، دفاعِ خلافت عثمانیہ اور تحریک احیاء وغلبۂ دین کے ضمن میں حضرت شیخ الہندؒ کے اصل جانشین مولانا مدنیؒ نہیں مولانا آزاد تھے!

اب مولوی سید محمود میاں ہوں یا دیگر معتقدین ومتوسلین حضرتِ مدنیؒ وہ مولانا مدنیؒ سے توسل وانتساب کا حق تو یقیناً Exclusively اپنے لیے ''محفوظ'' رکھ سکتے ہیں، لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ نسبت کی اجارہ داری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ راقم الحروف کو حضرت شیخ الہندؒ سے ایک نہیں دو دو سلسلوں اور واسطوں سے نسبت کا دعویٰ ہے۔ ایک بواسطہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ وتحریک پاکستان، اور دوسرے بواسطۂ مولانا ابوالکلام آزاد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی! اس لیے کہ مولانا آزاد کی نسبت تو حضرت شیخ الہند سے بلاواسطہ اور ''متصل'' ہے ہی، مولانا مودودی کا بھی خواہ مولانا آزاد سے کوئی معروف رشتہ نہ تھا لیکن

اس دور کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ان کی حیثیت مولانا آزاد کے معنوی خلیفہ ہی کی تھی...... اور راقم الحروف خواہ بہت ہی حقیر و ناچیز انسان ہے لیکن ؎

''کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی!''

کے مصداق ابوالکلام آزاد اور ان کی حزب اللہ (1912ء تا 1920ء) اور اس کے بعد مولانا مودودی اور ان کی تنظیم جماعت اسلامی (1939ء تا 1949ء) کے بعد اس خاکسار اور اس کی جماعت تنظیم اسلامی کو حضرت شیخ الہندؒ سے پختہ نسبت حاصل ہے! چنانچہ یہ حقیقت تو روز روشن کی طرح عیاں ہے ہی کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ''عوامی درس قرآن'' کے جو الفاظ 1920ء میں ادا کئے تھے ان کا واحد عملی مظہر ومصداق نہ صرف ارض پاکستان بلکہ اب دنیا بھر میں راقم ہی کا ''درس قرآن'' ہے!

اس ضمن میں آخری گزارش یہ کہ عزیزم محمود میاں نے حضرت مدنیؒ کے بارے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا جو حوالہ بہت طمطراق سے دیا ہے شاید ان کے علم میں بھی نہ ہو کہ اس تحریر کی اشاعت کا ذریعہ یہ خاکسار ہی بنا تھا...... ورنہ پروفیسر صاحب کی یہ تحریر دو سال تک انجمن خدام الدین، شیرانوالہ گیٹ لاہور کے دفتر میں پڑی رہی اور حضرت مدنیؒ کے معتقدین ومتوسلین کو اسے شائع کرنے کی جرأت نہ ہوئی، کہ

''کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!''۔

کے مصداق مولانا مدنیؒ کی مدح وستائش پر مشتمل تحریر اور پاکستان میں طبع ہو سکے! چنانچہ وہ ''یہی رند قدح خوار'' تھا جو چشتی صاحب کو شیرانوالہ لے کر گیا۔ اور مولانا عبید اللہ انورؒ سے ان کی وہ تحریر ''واگزار'' کرائی اور اپنے ماہنامہ ''میثاق'' میں نمایاں طور پر شائع کی اور شاید یہ بات بھی ماہنامہ ''انوار مدینہ'' کے تازہ واردان بساط ہوائے دل' کے علم میں نہ ہو کہ ''انوار مدینہ'' نے یہ تحریر ''میثاق'' ہی سے نقل کی تھی! عزیزی مولوی محمود میاں! بڑوں کی پگڑی اچھال دینا ہرگز کوئی مشکل کام نہیں!...... لیکن شریف النسب اور شریف النفس لوگ ایسا نہیں کیا کرتے! فافھموا وتدبروا!!!

(ماٗخوذ از ماہنامہ میثاق فروری 2003ء)

ڈاکٹر اسرار صاحب کی خدمت میں جواب آں غزل

از عبدالواحد

لاہور میں 9 دسمبر 2002ء کی ایک تقریب میں جس میں ڈاکٹر اسرار صاحب بھی موجود تھے اور تقریر کر چکے تھے نوائے وقت کے مجید نظامی صاحب نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ ''ڈاکٹر اسرار صاحب ایک جانب اقبال کے شیدائی ہیں تو دوسری جانب مولانا مدنی کے پیروکار ہیں حالانکہ مدنی، اقبال، قائداعظم اور پاکستان کا مخالف تھا۔'' مجید نظامی صاحب کی تقریر کے بعد ڈاکٹر اسرار صاحب نے مجید نظامی صاحب کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''میں مولانا مدنی کا پیروکار نہیں ہوں''۔ جس پس منظر میں اور جن حالات میں ڈاکٹر اسرار صاحب نے یہ الفاظ کہے ان سے جیسا کہ ہم آگے تفصیل سے ذکر کریں گے مولانا مدنی سے مکمل براءت کا اظہار ہو رہا تھا اس لیے جامعہ مدنیہ جدید کے مہتمم مولانا محمود میاں نے جنوری کے ماہنامہ ''انوار مدینہ'' میں بجا طور پر ڈاکٹر اسرار صاحب کی گرفت کی اور لکھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے مسلم جانشین ان کی روایات کے امین مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیزار ہو کر ڈاکٹر (اسرار) صاحب اپنے کو حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے کیسے وابستہ کر سکتے ہیں؟

اس کے جواب میں فروری کے ''میثاق'' میں ڈاکٹر اسرار صاحب نے تحریک آزادیٔ ہند میں حضرت شیخ الہندؒ کے اصل جانشین مولانا مدنیؒ کو نہیں مولانا ابوالکلام آزادؒ کو قرار دیا، لکھتے ہیں:

''بہرحال تحریک آزادی ہند دفاع خلافت عثمانیہ اور تحریک احیاء غلبۂ دین کے ضمن میں حضرت شیخ الہندؒ کے اصل جانشین مولانا مدنیؒ نہیں مولانا آزادؒ تھے۔''

نیز لکھتے ہیں:

''زہد و ورع اور استخلاص وطن اور دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کے میدان میں ان کے جانشین کی حیثیت مولانا مدنیؒ کو حاصل ہوئی اور یہ میرے نزدیک ایک بہت بڑی تاریخی غلطی تھی۔''

بات فقط اسی تک رہتی کہ وہ اپنے طبعی رجحان سے یا مثبت دلائل سے خواہ وہ کتنے ہی کمزور ہوتے مولانا مدنیؒ کو شیخ الہندؒ کا جانشین نہیں سمجھتے تو قابل برداشت تھا لیکن جب وہ اپنے دعوے کے اثبات کے لیے سرے سے باطل دلائل کا زور لگائیں تو یہ بات کسی بھی اعتبار سے قابل برداشت نہیں۔

اپنے اس دعویٰ پر جو دو باطل دلیلیں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دی ہیں وہ یہ ہیں:

(1) ہندوستان واپسی پر حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے خطبات کی تحریر مولانا مدنیؒ سے نہیں بلکہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے کرائی (خطبہ علی گڑھ کی بھی اور دوسرے سالانہ اجلاس جمعیت علمائے ہند کے خطبہ صدارت کی بھی)۔

(2) دوسرے سالانہ اجلاس میں امام الہند کا خطاب دے کر جس شخص کی بیعت پر علماء کو آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش حضرت شیخ الہندؒ نے کی وہ بھی مولانا مدنیؒ نہیں مولانا ابوالکلام آزادؒ تھے۔

اور شیخ الہندؒ ابوالکلام آزادؒ کو امام الہند کیوں بنانا چاہتے تھے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس کی دو وجہیں لکھتے ہیں:

(1) مولانا آزادؒ نے 1912ء سے الہلال اور پھر البلاغ کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کا جو غلغلہ بہت زور و شور سے بلند کیا تھا اس سے حضرت شیخ الہندؒ بہت متاثر ہوئے تھے اور انہیں محسوس ہو گیا تھا کہ کرنے کا اصل کام وہی ہے جس کی دعوت یہ نوجوان دے رہا ہے۔

کامل اس طبقہ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

(2) جب چار سال کی جلا وطنی اور نظر بندی جھیل کر شیخ الہندؒ واپس ہندوستان آئے تو (ابوالکلام آزاد کی گزشتہ باتوں کی وجہ سے) انہیں یقین کامل ہو گیا تھا کہ حالات وقت کی نبض پر ہاتھ ہم بوڑھوں کا نہیں اس نوجوان کا ہے۔ اوران سب باتوں کی روشنی میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دو فیصلے صادر فرماتے ہیں:

(1) ''لہٰذا تحریک استخلاص وطن، تحریک خلافت عثمانیہ اور تحریک تجدید احیاء غلبہ دین سب کے اعتبار سے حضرت شیخ الہندؒ کے جانشین اور خلیفہ مجاز کی حیثیت مولانا آزاد کو حاصل ہے جن کے ہاتھ پر خود بیعت کرنے کی خواہش وہ اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گئے۔''

(2) ''راقم الحروف (یعنی ڈاکٹر اسرار صاحب) کو حضرت شیخ الہند سے ایک نہیں دو سلسلوں اور واسطوں سے نسبت کا دعویٰ ہے۔ ایک بواسطہ مولانا شبیر احمد عثمانی و تحریک پاکستان اور دوسرے بواسطہ مولانا ابوالکلام آزاد اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس لیے کہ مولانا آزاد کی نسبت تو حضرت شیخ الہندؒ سے بلاواسطہ اور متصل ہے ہی مولانا مودودی کا بھی خواہ مولانا آزاد سے کوئی معروف رشتہ نہ تھا لیکن اس دور کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ان کی حیثیت مولانا آزاد کے معنوی خلیفہ ہی کی تھی۔ اور راقم الحروف خواہ بہت ہی حقیر و ناچیز انسان ہے لیکن ع

کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کے مصداق ابوالکلام آزاد اور ان کی حزب اللہ (1912 تا 1920ء) اور اس کے بعد مولانا مودودی اور ان کی تنظیم جماعت اسلامی (1939 تا 1949ء) کے بعد اس خاکسار اور اس کی جماعت تنظیم اسلامی کو حضرت شیخ الہند سے پختہ نسبت حاصل ہے''۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریر کا حاصل سامنے لانے کے بعد اب ہم قارئین کے سامنے قند مکرر کے طور پر وہ حقائق لانا چاہتے ہیں جو ہم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور انوار

مدینہ کے قارئین کے سامنے پہلے بھی رکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے ہماری کتاب ''ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار و نظریات تنقید کی میزان میں'' جو آج سے تیرہ سال قبل شائع ہوئی تھی یقیناً پڑھی ہے اس میں امام الہند سے متعلق پوری تحقیق ہم نے لکھی تھی لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب نے ان تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے دوبارہ انہی باتوں کا اعادہ کیا ہے اور ان کا یہ طرز عمل اس بات پر کافی گواہ ہے کہ ان کو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے کچھ بھی نسبت نہیں ڈاکٹر اسرار صاحب کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے تھی کہ محض لفاظی سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کا ایک دعویٰ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانا چاہتے تھے اور دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس میں ان کی بیعت پر علماء کو آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ دونوں دعوے فرضی ہیں۔ پہلے دعوے کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد نے شیخ الہند کو امام الہند کا منصب سنبھالنے پر آمادہ کیا تھا۔

جمعیت العلمائے ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس میں خود مولانا آزاد نے اپنے خطبہ صدارت میں حقیقت یوں بیان کی:

''1914ء کے لیل و نہار قریب الاختتام تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی اور مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک یہ (یعنی امارتِ شرعیہ کا) عقدہ حل نہ ہو گا ہماری کوئی سعی و جستجو بھی کامیاب نہ ہو گی۔ چنانچہ اسی وقت سے میں سرگرم سعی و تدبیر ہو گیا۔ حضرت مولانا محمود حسن (یعنی شیخ الہند) رحمہ اللہ سے میری ملاقات بھی دراصل اسی سعی و طلب کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق ظاہر فرمایا اور یہ معاملہ بالکل صاف ہو گیا تھا کہ وہ اس منصب کو قبول کر لیں گے اور ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ بعض زودرائے اشخاص کے مشورہ سے مولانا نے اچانک سفر حجاز کا ارادہ کر دیا اور میری کوئی منت

وساجت بھی انہیں سفر سے باز نہ رکھ سکی، اس کے بعد میں نظر بند کر دیا گیا......''

(جمعیت العلمائے ہند دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام جلد اول)

دوسرے دعوے کے برعکس حقیقت یہ ہے جمعیت العلماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس کا صدر خود شیخ الہندؒ کو مقرر کیا گیا تھا اور وہ اگرچہ اپنی بیماری اور کمزوری کے باعث اجلاس میں شریک نہ ہو سکے لیکن آپ کی صدارتی تقریر اجلاس میں پڑھ کر سنائی گئی۔ اس تقریر میں کئی باتیں تھیں لیکن ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانا تو کجا مسئلہ امامت و امارت کے بارے میں ایک لفظ بھی مذکور نہیں ہے بلکہ بقول مولانا آزاد جمعیت العلماء کے پاس یہ مسئلہ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد گیا ہے وہ فرماتے ہیں:

''مگر جب میں نے دیکھا کہ اب یہ مسئلہ منظر عام پر آ چکا ہے اور جمعیت العلماء اس کا آخری اور قطعی فیصلہ کر سکتی ہے تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ اسے جمعیت کے حوالے کر کے بالفعل خود سبکدوش ہو جاؤں چنانچہ ارکان جمعیت کی ایک خاص مجلس شوریٰ منعقدہ دہلی میں یہ مسئلہ پیش ہو کر بالاتفاق منظور ہوا اور اب اس کا آخری فیصلہ (جمعیت العلماء کے) اس (تیسرے سالانہ) اجلاس کے ہاتھ میں ہے۔''

لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب کو حقائق سے کیا غرض؟ ان کو دلچسپی اپنے دعووں سے ہے خواہ وہ سرے سے بے بنیاد ہوں کیونکہ ان کو تسلی ہے کہ وہ اپنے عقیدت مندوں کو اپنی لفاظی سے مطمئن کرتے رہیں گے۔ ہاں اپنے دعوے کی تائید میں ان کو جھوٹی سچی جو بات بھی مل جائے اس کو تائید غیبی سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔

اس لیے جب جناب سعید الرحمٰن صاحب علوی نے ڈاکٹر اسرار صاحب کو اپنے وہم کا تخلیق کردہ یہ قصہ فراہم کیا کہ:

''شیخ الہند نے شدید علالت کے دوران جمعیت علماء ہند کے دوسرے جلسہ 19 تا 21 نومبر 1920ء بمقام دہلی کی صدارت بھی فرمائی تھی اور خطبہ صدارت بھی ارشاد فرمایا تھا بقول مولانا محمد میاں بیماری و نقاہت کے سبب تھوڑی

دیر بھی اسٹیج پر بیٹھنا دشوار تھا لیکن اجلاس کے اہم ترین ایجنڈا یعنی امیر الہند کے انتخاب کے سلسلے میں ان کے احساسات یہ تھے میری چار پائی اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے جائی جائے اور یہ کام کر لیا جائے پہلا جو شخص بیعت کرے گا وہ میں ہوں گا۔'' (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص 452)

ڈاکٹر اسرار صاحب کو زورِ بیانی کے لیے یہ قصہ ہاتھ آ گیا اب ان کی بلا سے خواہ حقیقت سے وہ کتنا ہی بعید ہو کیونکہ اگر الزام آئے گا بھی تو وہ سعید الرحمٰن صاحب علوی کے سر تھوپ دیں گے۔ جب کہ ہمارے مطالبہ کے باوجود سعید الرحمٰن علوی صاحب مرحوم ہمیں اس کا حوالہ اور ماخذ نہ دکھا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمعیت العلماء کے اس اجلاس کے ایجنڈے میں تو سرے سے امیر الہند کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ خود شیخ الہند بیمار تھے اجلاس میں حاضر نہ ہوئے تھے پھر انہوں نے مولانا آزاد کی بیعت پر آمادہ کرنے کے لیے علماء میں بھرپور کوشش کیسے کی جب کہ اپنے خطبہ صدارت اور اختتامی تقریب میں ایک لفظ بھی اس مسئلہ پر نہیں کہا۔ پھر انتخاب ہونا تھا تو اس کے لیے پہلے سے امیدوار ہوتے ہیں یا نامزدگیاں ہوتی ہیں۔ مولانا آزاد کی نامزدگی شیخ الہندؒ نے کس وقت کی؟ کسی اور کی نامزدگی بھی موجود تھی تو کس کی تھی؟ کیا ڈاکٹر اسرار صاحب کو اپنے دامن عصمت پر ان میں سے کوئی بھی دھبہ نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے مولانا مدنیؒ کے جانشین نہ ہونے کے خلاف ایک دلیل یہ دی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے جمعیت العلماء کے دوسرے سالانہ اجلاس کا خطبہ صدارت مولانا مدنیؒ کے بجائے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے لکھوایا یہ بھی ڈاکٹر اسرار صاحب کی ایک بڑی تاریخی غلطی ہے کیونکہ کتاب ''بیس بڑے مسلمان'' اور ایچ بی خان کی کتاب ''برصغیر کی سیاست میں علماء کا کردار'' ان دونوں کے مطابق خطبہ صدارت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے لکھا تھا۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر اسرار صاحب نے مولانا مدنیؒ کی جانشینی کے خلاف جو دلیلیں دیں وہ دونوں اس پر مبنی ہیں کہ شیخ الہندؒ نے مولانا مدنیؒ کو کسی بھی اعتبار سے اپنا جانشین مقرر نہیں

کیا۔ خطبہ صدارت بھی ان سے نہیں لکھوایا اور تحریک آزادی کا امیر بھی مولانا آزاد کو بنانا چاہتے تھے۔ غرض جانشینی کی مختلف جہتوں سے جو چند کرسیاں تھیں ان میں سے ایک پر مولانا شبیر احمد عثمانی کو بٹھایا، دوسری پر مولانا انور شاہ کشمیری کو بٹھایا اور تیسری پر مولانا آزاد کو بٹھایا۔ مولانا مدنیؒ کو تو کسی بھی کرسی پر خود نہیں بٹھایا لہٰذا وہ کسی طور سے بھی جانشین نہیں۔

سبحان اللہ! ڈاکٹر صاحب نے جانشینی کا خوب فلسفہ نکالا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ جانشینی کا ایک طریقہ یہ ہے جو ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے لیکن اگر کوئی جانشینی سے کام کرے اور اس کا حق ادا کر دے تو اس کو بھی جانشین کا لقب دے دیا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب اس کو تاریخ کی ایک بڑی غلطی قرار دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کے نزدیک دین تو دین تاریخ بھی بس وہی ہے جو وہ سمجھتے ہیں۔ دین میں وہ تو خدائی فوجدار بن کر اترے ہوئے ہیں کہ ملک و ملت پر خدائی عذاب کے کوڑے برسواتے رہتے ہیں۔ تاریخ کو بھی وہ اپنا تابع فرمان بنا کر رکھنا چاہتے ہیں تا کہ جس طرح سے چاہیں لوگوں کو تاریخ دکھائیں۔ ڈاکٹر اسرار کی یہ دھونس انہی کو مبارک ہو۔ تحریک آزادی ہند جس پر شیخ الہندؒ کار بند رہے ان کے بعد اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ خدمات حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی ہیں اور اس اعتبار سے وہ بجا طور پر شیخ الہندؒ کے جانشین کہلانے کے مستحق ہیں اس کے لیے کسی کو ڈاکٹر صاحب سے سند لینے کی ضرورت نہیں ہے کہ جن کا نہ علم دین مستند ہے اور نہ علم تاریخ مستند ہے ہم نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے آئینہ حقیقت پیش کر دیا ہے جس میں وہ اپنے کمالات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

جب یہ ثابت ہو چکا کہ شیخ الہندؒ کا مولانا آزاد کو امیر الہند بنانے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا تو یہ بات بھی خود بخود واضح ہو گئی کہ مولانا آزاد کو امیر الہند بنانے کے دو سبب جو ڈاکٹر اسرار صاحب نے شیخ الہندؒ کی طرف منسوب کئے ہیں محض خیالی و اختراعی ہیں۔

البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو امیر الہند بنانے کی خود ساختہ تجویز سے ڈاکٹر اسرار کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب خود دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس مسئلہ سے ڈاکٹر اسرار صاحب کی دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تحقیق و تفتیش کے دوران ان پر یہ بات

منکشف ہوئی کہ شیخ الہندؒ کے نام لیواؤں کے سامنے وہ حضرت شیخ الہند کے اس عمل سے سند پکڑ سکتے ہیں اور ان کو اپنی تائید کی دعوت دے سکتے ہیں اس لیے انہوں نے ایک طرف اپنی جماعت میں شیخ الہند کی شخصیت کو خوب نمایاں کرنے کی کوشش کی اور ان کو مجدد تک کہا اگر چہ وہ اپنے حلقہ میں پہلے ہی نمایاں تھے اور دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد کو خوب گرانے کی کوشش کی تا کہ شیخ الہندؒ کے نام لیواؤں سے کہہ سکیں کہ میں تو پھر بھی ان سے بہت اچھا ہوں اور شیخ الہندؒ اتنے وسیع القلب تھے کہ آزاد جیسے رندان قدح خوار کو اپنا خرقہ خلافت دیا اور ان کو امام الہند بنانے کے لیے بے تاب ہوئے تو تم بھی کچھ وسعت قلبی کا مظاہرہ کرو اور کم از کم میری مخالفت نہ کرو بلکہ میرے ساتھ تعاون کرو۔

ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں:

”اس (یعنی ابوالکلام آزاد کی بیعت امامت کی تجویز) کی تحقیق و تفتیش کے دوران جو انکشافات مجھ پر ہوئے ان میں سے اہم ترین حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی المعروف شیخ الہندؒ کی عظمت، شان اور جلالت قدر کے بارے میں تھا جن سے اس وقت تک میں اصلاً تو ان کے ترجمہ قرآن کے حوالے ہی سے واقف تھا اور اس کی بنا پر میرے دل میں ان کے لیے ایک گونہ محبت و عقیدت بھی موجود تھی۔ مزید برآں ان کی ذاتی عظمت، ان کے تقویٰ و تدین، ان کے اخلاص و للّٰہیت، ان کا علم و فضل، ان کے مجاہدانہ کردار، ان کی عالی ہمتی اور جہاد و حریت اور تحریک استخلاص وطن میں ان کے مقام و مرتبہ کا تو کسی قدر اندازہ تھا لیکن ان کی وسعت نظر، ان کی عالی ظرفی، ان کی معاملہ فہمی، ان کی انسان شناسی، ان کی وسعت قلبی، اور سب سے بڑھ کر ان کی عاجزی و انکساری کا کوئی اندازہ راقم کو نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذاتی عظمت کے اس پہلو کے یکبارگی انکشاف سے راقم پر ایک مبہوتیت سی طاری ہو گئی...... وہ دن اور آج کا دن! راقم کی پختہ رائے ہے کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہند تھے اس لیے کہ ان کی سی جامعیت کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت اس پوری صدی میں کم

ازکم مجھے نظر نہیں آتی۔''

(جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص:446)

ڈاکٹر اسرار صاحب کو شیخ الہند کی وسعت نظر، ان کی عالی ظرفی، ان کی معاملہ فہمی، ان کی انسان شناسی، ان کی وسعت قلب اور سب سے بڑھ کر ان کی عاجزی وانکساری کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ ابوالکلام آزاد جیسا شخص کہ جس کا حال بقول ڈاکٹر صاحب یہ تھا:

''ایک نوخیز نوجوان جس کی زبان میں تاثیر، قلم میں زور اور اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک، کے مصداق جہاد کا جذبہ اور جوش تو بے شک موجود تھا لیکن نہ جبہ و عمامہ، نہ عبا و قبا، نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث حتیٰ کہ نہ کہیں کہ سند فراغت، نہ دستار فضیلت، ایک قرآن کا عاشق ہونے سے کیا ہوتا ہے''۔ (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص65)

اور لکھتے ہیں:

''مزید غور فرمائیے ہندوستان تقلید کا گڑھ ہے یہاں اسلام کے معنی ہی حنفیت کے ہیں اور تقلید کے دائرے سے باہر قدم نکالنے کے معنی گویا اسلام سے نکل جانے کے ہیں اور بقول مولانا محمد انور شاہ کاشمیری ''علمی کام'' کا مطلب یہاں صرف یہ رہا ہے کہ مسلک حنفی کی فوقیت دوسرے مسلکوں پر ثابت کی جائے اور خود حضرت شیخ الہندؒ پکے حنفی تھے...... دوسری طرف ابوالکلام آزاد حنفیت سے حد درجہ بعید، تقلید سے کوسوں دور، ایک آزاد خیال انسان جس کی اصل عقیدت تھی ابن تیمیہ سے''۔ (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص65)

مزید لکھتے ہیں:

''جو نہ ان (شیخ الہند) کے تلامذہ میں سے تھا نہ حلقہ دیوبند سے تعلق رکھتا تھا بلکہ علماء کے دیگر معروف حلقوں اور سلسلوں میں سے بھی کسی سے منسلک نہ تھا حتیٰ کہ علماء کی سی وضع قطع بھی نہ رکھتا تھا بلکہ بقول خود ''کلیم زہد اور ردائے رندی'' دونوں کو بیک وقت زیب تن کرنے کے جرم کا مرتکب تھا۔

(جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص13)

غرض ڈاکٹر اسرار صاحب نے ناجائز حد تک غلو سے کام لیتے ہوئے ابوالکلام آزاد کا یہ حال بتایا کہ نہ وہ عالم تھے، نہ مقلد تھے اور نہ ہی علماء کی سی وضع قطع رکھتے تھے ہاں صرف قرآن کے عاشق تھے۔ اب ایسے شخص کے ساتھ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ نے ڈاکٹر اسرار صاحب کے الفاظ میں یہ برتاؤ کیا کہ:

''حضرت شیخ الہند کی وسعت قلبی اور عالی ظرفی کا سب سے بڑا مظہر مولانا آزاد کے معاملے میں ان کا طرز عمل ہے بڑے لوگوں کی بڑائی کا ایک اہم پہلو چھوٹوں کی بڑائی کا اقرار اور ان کی ابھرتی ہوئی شخصیتوں کو خواہ مخواہ اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ کر انہیں دبانے کی فکر کرنے کی بجائے ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی صورت میں سامنے آتا ہے اور اس پہلو سے واقعہ یہ ہے کہ عظمت کا کوہ ہمالیہ معلوم ہوتے ہیں شیخ الہندؒ''۔ (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص64)

پھر لکھتے ہیں:

''بایں ہمہ اس استاذ العلماء کا یہ قول ان کے شاگردوں کے حلقے میں معروف ہے کہ اس نوجوان (ابوالکلام آزاد) نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اللہ اکبر! ہے کوئی حد اس وسعت قلبی اور عالی ظرفی کی۔ فارجع البصر هل ترى من فطور''۔ (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص65)

اور مزید لکھتے ہیں:

''بایں ہمہ مولانا ان کے جوہر قابل کے قائل بھی ہیں اور انہیں امام الہند مان لینے کی تجویز کے پرزور مؤید بھی، پھر غور کیجئے کہ ہے کوئی حد اس عالی ظرفی اور وسعت قلبی کی اور ہے اس کی کوئی دوسری مثال اس دور میں ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاسئا و هو حسير''۔

(جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص66)

ابوالکلام آزاد کا جو نقشہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے کھینچا ہے اس کے ہوتے ہوئے شیخ

الہندؒ کی ان کے حق میں عالی ظرفی اور وسعت قلبی میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے حق میں شیخ الہندؒ کے نام لیوا علماء کی رائے ہموار کرنے کے لیے بڑی قوی دلیل نظر آئی کیونکہ:

☆ اگر ڈاکٹر اسرار معروف معنی میں دیوبندی نہیں تو ابوالکلام آزاد کا بھی حلقہ دیوبند سے تعلق نہ تھا۔

☆ اگر ڈاکٹر اسرار عالم دین نہیں تو ابوالکلام آزاد کو بھی سند فراغت حاصل نہ تھی۔

☆ اگر ڈاکٹر اسرار پورے مقلد نہیں تو ابوالکلام آزاد تو تقلید سے کوسوں دور تھے۔

بلکہ خوش فہم ڈاکٹر اسرار صاحب میں تو کچھ زائد خوبیاں ہیں۔

☆ ابوالکلام تو آزاد خیال انسان تھے جب کہ ڈاکٹر اسرار صاحب شریعت کے پورے پابند ہیں۔

☆ ابوالکلام آزاد علماء کی سی وضع قطع نہ رکھتے تھے جب کہ ڈاکٹر اسرار صاحب آج کل کے علماء کی سی وضع قطع رکھتے ہیں۔

☆ ابوالکلام آزاد سرے سے مقلد نہ تھے جب کہ ڈاکٹر اسرار صاحب نیم مقلد تو ہیں اور اس دلیل کو مزید تقویت دینے کے لیے شیخ الہندؒ کے پلڑے کے وزن میں مزید اضافہ کرنے کے لیے ان کو چودہویں صدی کا مجدد قرار دیا۔

لکھتے ہیں:

''وہ دن اور آج کا دن راقم کی پختہ رائے ہے کہ چودھری صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے اس لیے کہ ان کی سی جامعیت کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت اس پوری صدی میں کم از کم مجھے نظر نہیں آئی''۔

''چودہویں صدی ہجری کے بارے میں راقم کا یہ گمان رفتہ رفتہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا ہے کہ اس کے مجدد اعظم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہیں''۔ (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص 13)

حضرت شیخ الہندؒ کا مجدد یا مجددِ اعظم ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں البتہ ڈاکٹر اسرار صاحب یقیناً داد کے قابل ہیں کہ انہوں نے کس صفائی سے اپنے حق میں دلیل کو استوار

کرنے کی کوشش کی اور بالآخر دل کی بات زبان پر لے ہی آئے اور یوں گویا ہوئے:

''اب اگر ایک حقیر و ناتواں انسان نے وقت کے اس تقاضے پر لبیک کہتے ہوئے اس کام کا بیڑا اٹھا ہی لیا ہے تو کیا علماء کرام بالخصوص اس حلقے سے وابستہ حضرات جو حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت کے پوری طرح قائل ہیں اور مولانا آزاد مرحوم کو بھی کسی نہ کسی درجے میں اپناتے ہیں کا کام یہ ہے کہ اسے طنز وتشنیع کا ہدف بنائیں یا یہ کہ نوجوان اس کا ساتھ دیں اور بزرگ اس کی سرپرستی فرمائیں۔'' (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص 92)

آخر میں لکھتے ہیں:

''کاش کہ علمائے کرام ہماری ان گزارشات پر سیخ پا نہ ہوں بلکہ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ؏

وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

نوٹ:

(1) ڈاکٹر اسرار صاحب نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے ابوالکلام آزاد کو غیر عالم بتایا حالانکہ وہ مسلمہ عالم دین تھے مولانا آزاد خود لکھتے ہیں ''1903ء میں کہ عمر کا پندرھواں سال شروع ہوا تھا میں درس نظامیہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا...... فاتحہ فراغ کی مجلس ہی میں طلبا کا ایک حلقہ میرے سپرد کر دیا گیا...... میں طلباء کو مطول، میر زاہد اور ہدایہ وغیرہ کا درس دیتا تھا۔ (غبار خاطر ص 98-99)

سکہ بند اور مسلم عالم دین ہونے کی آخر اس سے بڑھ کر اور کیا صراحت ہوگی۔

(2) ڈاکٹر اسرار صاحب جب تاریخ اور دین دونوں ہی کو مسخ کرنے سے نہیں چوکتے اور نشاندہی کرنے پر بھی ماننے کو تیار نہیں ہوتے تو وہ کس منہ سے علماء کا تعاون طلب کرتے ہیں۔

تاریخ کا مسخ تو ہم ذکر کر چکے۔ اب ڈاکٹر اسرار صاحب کے دین میں مسخ کی بھی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(1) ڈاکٹر اسرار صاحب بھی فرماتے ہیں کہ جس کے دل میں نہ تو مثبت طور پر ایمان ہو اور نہ منفی طور پر کفر ہو بلکہ دل دونوں سے خالی ہو۔ گویا حالت صفر یعنی Zero Value کی ہو وہ اگر نیک عمل کرے تو اس کے اعمال مقبول ہیں اور اپنے اس باطل عقیدے کو وہ قرآن پاک کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ اعمال کی قبولیت کے لیے ایمان کے وجود کی شرط قرآن پاک میں صراحت سے مذکور ہے۔

(2) ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کو قرآن سے ثابت مانتے ہیں حالانکہ قرآن کی تصریحات اس کی کلی نفی کرتی ہیں۔

(3) دین اور عبادت کا جو معنی ڈاکٹر اسرار صاحب بتاتے ہیں وہ قرآن و حدیث کے مطابق باطل ہے۔

(4) قرآن پاک کو سمجھنے کے بقدر عربی زبان سیکھنے کو فرض عین قرار دیتے ہیں۔

(5) گناہ پر اصرار پر ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنے کا فتویٰ دیتے ہیں۔

مولانا مدنیؒ سے ڈاکٹر اسرار صاحب کا اختلاف:

نوائے وقت (8 جنوری 2003ء) میں شائع شدہ اپنے وضاحتی مضمون میں ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں:

''میرا مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی حکمت عملی سے ہمیشہ شدید اختلاف تھا اور تا حال ہے''۔

ہم کہتے ہیں حکمت عملی کا اختلاف علمی اختلاف ہوتا ہے کیونکہ سیاسی حکمت عملی کا مطلب ہے سیاسی عمل کی حکمت وعلت۔ (جاننا چاہیے کہ عام محاورہ میں لوگ حکمت اور علت کو ایک ہی سمجھتے ہیں) تو ڈاکٹر اسرار صاحب یہ بتاتے ہیں کہ ان کو مولانا مدنیؒ کی سیاست کی علت وحکمت سے یعنی ان کے سیاسی عمل کے علمی پہلو سے اختلاف تھا اور تا حال ہے۔ اوائل کے دور میں تو شاید دوسروں کی دیکھا دیکھی یہ اختلاف کرتے ہوں گے لیکن اب تو ایسا نہیں ہے خود ڈاکٹر اسرار صاحب فرماتے ہیں:

''1957ء کے بعد کے پینتالیس برس کے دوران میں صرف اللہ کا بندہ

اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا پیروکار رہوں اور اللہ کی اور سنت رسول میرے رہبر اور میرا ضمیر میرا ''امیر'' رہا ہے''۔

(نوائے وقت 18 جنوری 2003ء)

اصل اختلاف اس میں تھا کہ کیا موجودہ حالات میں اور مسلم لیگی قیادت کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے کیا مسلمانوں کو باقی ہندوستان سے کٹ کر صرف ایک ٹکڑے کا مطالبہ کرنا جائز ہے اور کیا اس میں واقعی اسلامی نظام قائم ہو سکے گا۔ یہ مسئلہ شریعت کا مسئلہ ہے محض ایک مباح انتظامی مسئلہ نہیں تھا۔ مولانا مدنیؒ کی اپنی رائے تھی اور مولانا تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی اپنی رائے تھی۔ یہ حضرات شریعت کو سمجھنے والے تھے اس لیے رائے رکھنے کے اہل تھے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب کی یہ تصریحات جا بجا ملتی ہیں کہ فقہ کے بارے میں ان کا علم بہت محدود ہے اور وہ عالم نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا ضمیر خود بخود قرآن وسنت سے رہنمائی لے کر ان کا باکمال امیر بنا ہوا ہے کہ وہ ان کو یہ بھی بتا دیتا ہے کہ مولانا مدنیؒ جیسا عالم غلطی کر رہا ہے اور مولانا مدنیؒ کس شمار میں ہیں۔ ان کے باکمال ضمیر اور عالی دماغ مزاج ائمہ اربعہ اور امام بخاری کے دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو بھی اقرب الی السنۃ اور اقرب الی الصواب سمجھتے ہیں اس کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص 371)

ڈاکٹر اسرار صاحب جو چاہیں لکھیں لیکن ان کی اپنی تحریریں ان کے جہل مرکب کی طرف واضح رہنمائی کیے دے رہی ہیں۔

مولانا مدنیؒ سے ڈاکٹر اسرار صاحب کا اظہار براءت:

ڈاکٹر اسرار صاحب کا ضمیر ان پر کس طرح سے امیری اور حکمرانی کر رہا ہے اس کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ایک تقریب میں جس میں ڈاکٹر اسرار صاحب بھی موجود تھے اور تقریر کر چکے تھے نوائے وقت کے مجید نظامی صاحب نے کہا کہ:

''پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنا ہے تو خدارا اسلام کو اقبال کے ذریعہ

سمجھنے کی کوشش کریں اور اگر ہم سیاست کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پاکستان میں قائد اعظم کی سیاست رائج کریں۔‘‘

’’ڈاکٹر اسرار صاحب ایک جانب اقبال کے شیدائی ہیں تو دوسری جانب مولانا مدنیؒ کے پیروکار ہیں حالانکہ مدنی اقبال، قائد اعظم اور پاکستان کا مخالف تھا؟ حیرت ہے کہ یہی معاملہ فرزند اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال کا بھی ہے کہ وہ بھی کہتے ہیں کہ اقبال بھی ٹھیک تھا اور مدنی بھی ٹھیک تھا۔‘‘

غرض مجید نظامی صاحب نے اسلام، سیاست اور مسئلہ قومیت کی بات کی۔ یہ تینوں امور شریعت کے ہیں اس لیے ڈاکٹر اسرار صاحب پر لازم تھا کہ وہ جواب میں کہتے کہ امور شرعیہ میں کسی اچھے عالم یا مولانا مدنیؒ کے پیروکار ہونے میں کیا حرج ہے لیکن اس کے برعکس ڈاکٹر اسرار صاحب نے مجید نظامی صاحب کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا ضروری سمجھا (نہ جانے خاموش رہنے میں کونسا بھونچال آ جاتا؟) اور اطلاق کے ساتھ یوں کہا کہ ’’میں مولانا مدنی کا پیروکار نہیں ہوں‘‘۔ اگر کہنا ہی تھا تو مقید کر کے یوں کہتے کہ میں سیاست میں مولانا مدنیؒ کا پیروکار نہیں ہوں۔ لیکن جب مطلق پس منظر میں مطلق الفاظ کہے تو مجید نظامی صاحب نے فوراً ہی ان کی گرفت کر لی اور رپورٹروں سے یہ کہا کہ نوٹ کرلو’’ڈاکٹر صاحب مدنیؒ سے اظہار براءت کر رہے ہیں۔‘‘

مولانا محمود میاں کی اس پر گرفت سے ڈاکٹر اسرار صاحب کو اپنی پگڑی تو اچھلتی نظر آ گئی لیکن جب مجید نظامی صاحب اپنی باتوں سے مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی پگڑی اچھال رہے تھے تو ڈاکٹر اسرار صاحب کے با کمال ضمیر اور عالی مزاج دماغ نے اس میں کوئی باک نہ سمجھا کہ اچھلتی پگڑی کو ایک اچھالا خود بھی دیدیں۔

شریف النسب اور شریف النفس واقعی بڑوں کی پگڑیاں نہیں اچھالا کرتے لیکن اگر بڑے اپنی بڑائی کو چھوڑ کر بیٹھیں اور دوسرے واجب الاحترام لوگوں کی ہی نہیں دین کی پگڑی بھی اچھالنے لگیں تو وہ بڑے ہی کہاں رہے۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب کے فرزند اور جاوید احمد غامدی کے شاگرد

عمار خان ناصر کے افکار و نظریات کا تنقیدی جائزہ

بنام

عمار خان کا نیا اسلام

اور

اس کی سرکوبی

تالیف

☆ مقام عبرت (نیا ایڈیشن)

☆ توہین رسالت کا مسئلہ اور عمار خان

☆ مسجد اقصی کی تولیت اور عمار خان کی یہود نوازی

حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم

☆ اسلام کا تصور جہاد اور عمار خان

مفتی شعیب احمد صاحب مدظلہ

ناشر

دارالامین